مستقبل کے میاں داد کا انٹرویو
ماہنامہ
کراچی
آنکھ مچولی
اپریل ۱۹۹۴ء
عربوں کا ایٹم بم
ایک معلوماتی مضمون
جب انڈے بول اٹھے
جیتے جاگتے انڈوں کا تصویری فیچر
کنجوس کی فریاد
بچوں کے مقبول شاعر عبدالقادر کی نظم
ہم نے بچوں کو الیکشن لڑایا
ہنستی کھیلتی ایک کہانی
کہانیاں، نظمیں، رنگین تصویریں
دلچسپ انعامی مقابلے اور دوسرے مزیدار سلسلے

G30 Colorscan

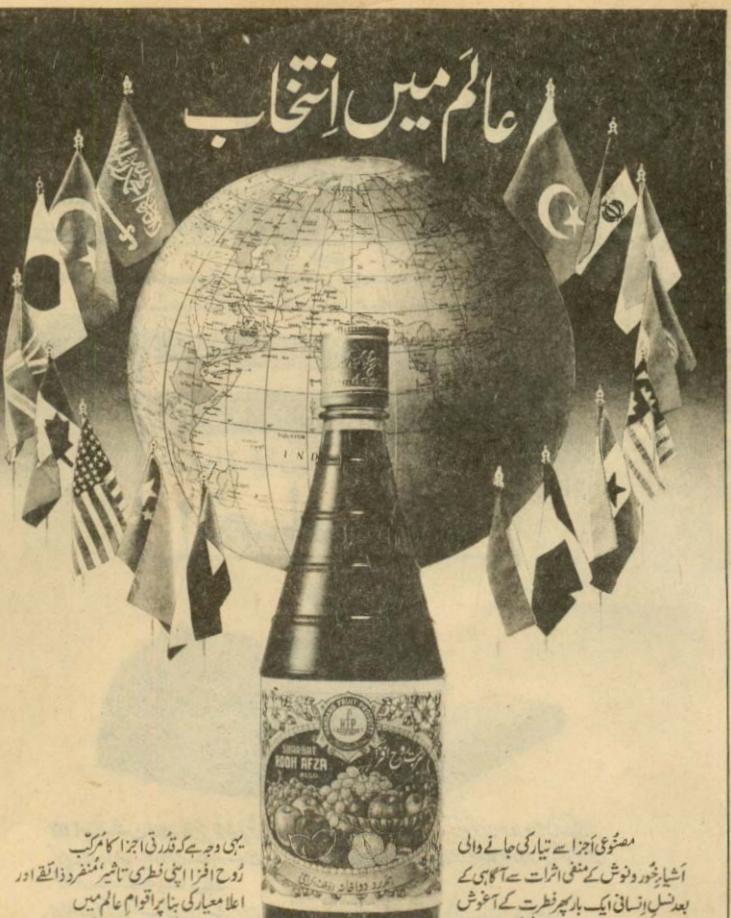

Adarts-HRA-5/92

ACTION
جونیئر کوئیز
ایکشن جونیئر برش کی خریداری پر
ہر ماہ بچوں کے لئے ہزاروں
انعامات
ACTION
ACTION
ایکشن جونیئر ٹوتھ برش خریدتے ہوئے دکاندار سے ایک کوئیز کوپن ضرور حاصل کیجئے۔
کوپن میں درج اپنے وطن کے بارے میں ۵ سوالوں کے صحیح جوابات دیجئے اور ہر ماہ ہزاروں کی تعداد میں
خوبصورت تحفے جیت لیجئے۔
جوابات کا کوپن آپ ہمیں پوسٹ کر دیں، یا اپنے پسندیدہ تحفے پر نشان لگا کر اپنے قریبی دکاندار
کے پاس جمع کرائیں۔
"پہلے آیئے، پہلے پایئے" کی بنیاد پر ہر ماہ موصول ہونے والے پہلے دو ہزار جوابات پر آپ کی اپنی پسند کے
قیمتی انعامات، آپ کے دروازے پر!
یونیورسل برش وَیر (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ESTD. 1947
UNIVERSAL
REGD. TRADE MARK
R-LINTAS

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت
رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی
رکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی نقیب

آنکھ مچولی

جلد نمبر ۸ شمارہ نمبر ۱۰

شوال / ذی القعدہ ۱۴۱۴ھ اپریل ۱۹۹۴ء

مدیر اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

منتظم اعلیٰ
تجمل حسین چشتی

مینجنگ ایڈیٹر
ایم اے فاروقی

مدیر اعزازی
طاہر مسعود

مجلس ادارت
منیر احمد راشد، محمد عمر احمد خان

سرکولیشن مینجر
بابر فاروقی

مصوّر
مومن رحیم

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔
ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونیوالی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔
ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا ہے۔

قیمت ۱۰ روپے
۷ درہم ۷ ریال

فون: ۴۹۴۲۸۵۷

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی ۱- پی آئی بی کالونی کراچی ۵ (۷۴۸۰۰)

ناشر: ظفر محمود شیخ - طابع: زاہد علی - مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس ایم اے جناح روڈ کراچی

جب آپ نیلے آسمان پہ محوِ سفر ہوتے ہیں
تو آنکھ مچولی آپ کا ہم سفر ہوتا ہے

جی ہاں!

اگر آپ کبھی پی آئی اے سے سفر کر رہے ہوں
اور آپ کا دل کچھ پڑھنے کو چاہے ——— تو آپ اپنے فضائی میزبان
سے آنکھ مچولی کا تازہ شمارہ طلب کر سکتے ہیں
بات صرف اتنی سی ہے

آپ جہاں ہیں — آنکھ مچولی وہاں ہے

• دلچسپ کہانیاں • مزیدار نظمیں • معلوماتی مضامین • چونکا دینے والی تصویریں
اور وہ سب کچھ جو صرف آنکھ مچولی میں ہوتا ہے

وقت کا بہترین استعمال آنکھ مچولی کا مطالعہ

آنکھ مچولی کو آپ ہمیشہ ایک سچا اور وفادار دوست پائیں گے

ادارہ آنکھ مچولی 1۔ پی آئی بی کالونی، کراچی

حسنِ ترتیب

سنہرے حروف — سید غلام مصطفےٰ ہمدانی — ۸
ماہِ رواں کی پہلی بات — اداریہ — ۹
حمد باری تعالیٰ (نظم) — ضیغم جیدی — ۱۰
حیرت انگیز شخصیت — محمد بن مالک — ۱۱
بہتر راستہ — یسما صدیقی — ۱۴
مستقبل کے میانداد — سلیم خالق — ۲۱
اے میرے وطن (نظم) — سعدیہ یاسمین — ۲۵
پیاری بچی — آصف فرخی — ۲۶
عربوں کا ایٹم بم — علی جبران — ۳۲
انوکھی شرارت — صبا امروز — ۳۴
الگو میں کیری بو — سید عرفان علی یوسف — ۳۹
مجھے اب بھیڑیوں سے ڈر نہیں لگتا (نظم) — شاہدہ صدف — ۴۴
ایک پُراسرار براعظم — سید عدنان یوسف — ۴۶
ہم نے بچوں کو الیکشن لڑایا — خرم طارق جگنو — ۵۰
سوال یہ ہے — ایاز محمود — ۵۳

ہنستے ہنستے — لطائف — ۵۷
پچرنگی بانسری نواز — نعیم مشتاق نومی — ۶۱
بچے کا خواب — حافظ مظفر محسن — ۶۷
دوستی — عالیہ صلاح الدین — ۶۹
امتحان ہے آپ کی ذہانت کا — ادارہ — ۷۵
(نظم) کنجوس کی فریاد — عبدالقادر — ۷۹
وہ کیا راز تھا — محمد عمر احمد خان — ۸۰
عکس ادھورے کیجیے پورے — ادارہ — ۸۲
اچھوتا کاروبار — محمد فاروق دانش — ۸۹
بنام آنکھ مچولی — خطوں کے جواب — ۹۴
(نظم) دو ڈرائیور — عنبر چغتائی — ۹۸
قصور میرا ہی تھا — نصیر الدین احمد — ۹۹
(نظم) صفائی — زاہد الحسن زاہد — ۱۰۷
بچ پاتو — اشتیاق احمد — ۱۰۸
قلم دوست — ننھی تحریریں — ۱۱۵

شہرِ حروف

خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں مسلمانوں کی سلطنت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف علم کا چرچا تھا اور لوگوں کو علم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ علما اور اساتذہ کو بہت عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ خلیفہ خود بھی اساتذہ اور علما کی قدر کرتا تھا اور اس کے دربار میں انہیں بلند مرتبہ حاصل تھا۔

خلیفہ کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام مامون تھا اور دوسرے کا امین۔ دونوں صاحبزادوں کو علم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنے اساتذہ کی بہت عزّت کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے دونوں صاحبزادے اپنے والد خلیفہ ہارون الرشید کے ساتھ جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لئے جامع مسجد میں گئے۔ اس مسجد میں مامون اور امین کے اُستاد بھی موجود تھے۔ جب جمعہ کی نماز ختم ہوگئی اور لوگ اپنے اپنے جوتے اٹھائے مسجد سے باہر جانے لگے تو دونوں صاحبزادے مسجد کے اس کونے کی طرف لپکے جہاں ان کے اُستادِ محترم کے جوتے رکھے ہوئے تھے۔ دونوں میں سے ہر ایک کی خواہش یہ تھی کہ وہ آگے بڑھ کر اپنے اُستاد کے جوتے اُٹھائے لیکن اتفاق یہ کہ دونوں ایک ساتھ وہاں پہنچے اور ایک نے ایک جوتا اُٹھالیا۔ دوسرے نے دوسرا۔ خلیفہ ہارون الرشید ذرا فاصلے پر کھڑا یہ سب ماجرا دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔

اگلے روز جب خلیفہ اپنے مصاحبوں، وزیروں اور دوستوں کے ساتھ دربار میں بیٹھا تو اس نے ان سے پوچھا۔ "تمہارے خیال میں سب سے زیادہ خوش نصیب انسان کون ہے؟"

مصاحبوں میں سے ایک نے جو دیا "حضور آپ کو خدا نے مسلمانوں کا خلیفہ بنایا ہے اور یوں آپ کا رُتبہ سب سے بلند کیا ہے۔ آپ سے زیادہ خوش نصیب بھلا کون ہوگا؟ خلیفہ نے کہا "نہیں ایک شخص مجھ سے بھی زیادہ خوش نصیب ہے۔" مصاحبوں نے پوچھا "حضور! وہ شخص کون ہے؟ ہم بھی تو جانیں۔"

خلیفہ نے جواب دیا "سب سے زیادہ خوش نصیب وہ اُستاد ہے جس کے جوتے خلیفہ وقت کے بیٹے اُٹھاتے ہیں اور فخر محسوس کرتے ہیں۔"

مُرسلہ ..... سیّد غلام مصطفےٰ ہمدانی، لاہور کینٹ

پہلی بات

دو نمازی کسی مسجد کے وضو خانے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے شیخی بگھارتے ہوئے کہا "میرے محلے کی مسجد میں وضو کرنے کے لئے جو حوض ہے وہ بہت بڑا ہے۔ اس مسجد کے حوض سے تو اس کا کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔" ایک بزرگ نے یہ گفتگو سنی تو اس شخص سے کہا کہ کل تم اپنی مسجد کے حوض کو ذرا ناپ کر آنا۔ وہ شخص ان بزرگ کا بہت احترام کرتا تھا۔ اس نے ہدایت کی تعمیل کی اور جب اس نے اپنے علاقے کی مسجد کے حوض کی پیمائش کی تو وہ صرف ایک بالشت بڑا تھا۔ اس نے واپس آکر یہ بات ان بزرگ سے بتائی۔ بزرگ نے فرمایا "ایک بالشت کا فرق تو کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ تم تو کہتے تھے کہ مسجد کا حوض بہت ہی بڑا ہے۔ تھوڑے سے سچ کو اتنا بڑھا دینا کہ وہ جھوٹ بن جائے، اس سے تو آدمی گناہ گار ہو جاتا ہے۔" یہ سن کر وہ شخص سخت شرمندہ ہوا۔

ہم اور آپ اپنی عادتوں پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ ہمارا حال بھی اس شخص نے کچھ مختلف نہیں۔ ہم لوگ بھی معمولی باتوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کے عادی ہیں۔ کوئی واقعہ سنانا ہو تو خوب نمک مرچ لگا کر سنائیں گے۔ کسی سے کوئی چھوٹی سی شکایت ہے تو اس کی ذات میں ایسے ایسے کیڑے نکالیں گے کہ خدا کی پناہ۔ اپنی کسی کامیابی کا تذکرہ کریں گے تو اس زور و شور سے جیسے کوہ ہمالیہ سر کر لیا ہو۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی غلط بیانی، بہانے بازی اور وعدہ خلافی ہماری عادت ہو چکی ہے۔ یہ سب کچھ کرتے ہوئے ہمیں ذرا یاد نہیں رہتا کہ بظاہر ان بے ضرر باتوں کے کتنے بڑے نقصانات ہیں۔ حالانکہ یہ وہ باتیں ہیں جو آہستہ آہستہ ہمارے کردار کو تباہ کر دیتی ہیں۔

آپ نے یہ تو سنا ہی ہو گا کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ جھوٹ کبھی نہ کبھی سامنے آ ہی جاتا ہے۔ ہم کسی حقیقت کو چھپانے کے لئے غلط بیانی کرتے ہیں لیکن جب وہ حقیقت اچانک سامنے آجاتی ہے تو ہمارے لئے شرمندہ ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ ہماری ذات کا اعتبار ختم ہو جاتا ہے۔ لوگ ہمیں جھوٹا اور وعدہ خلاف سمجھنے لگتے ہیں اور یہ کہہ کر کہ "چھوڑو بھی، اس کا کیا اعتبار، ہمیشہ بے پر کی اڑاتا ہے"، وہ ہماری بات پر یقین کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ تو وہ نقصان ہیں جو دنیاوی ہیں۔ سب سے بڑا نقصان تو وہ ہے جو آخرت میں پہنچتا ہے۔ ہم اللہ کے نزدیک گناہ گار ہوتے ہیں۔ جھوٹے آدمی کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ اس کی نماز میں خلوص باقی نہیں رہتا اور آخرت میں جھوٹ بولنے کا عذاب الگ ملتا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سچ بولنا بہت مشکل کام ہے۔ کسی حد تک یہ صحیح ہے۔ سچ بولنے میں وقتی تکلیف ضرور ہوتی ہے۔ کیونکہ سچ بولتے ہوئے ہمیں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ اندیشہ بے بنیاد ہوتا ہے۔ آپ کبھی آزمانے کے لئے سچ بول کر دیکھئے۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کو آپ کے سچ نے بچالیا ہے۔ سچ میں بڑی قوت ہوتی ہے۔ آپ کی سچائی ظاہر کرتی ہے کہ آپ ایک مضبوط کردار کے مالک ہیں۔ کوئی خوف اور کوئی اندیشہ آپ کو سچ بولنے سے باز نہیں رکھ سکتا۔ رفتہ رفتہ لوگ آپ کی ذات پر اعتماد کرنے لگتے ہیں۔ آپ کو قابلِ بھروسہ سمجھتے ہیں اور آپ کو ہر جگہ عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جانے لگتا ہے۔ اور پھر سچ بولنا آپ کے لئے آسان بھی ہو جاتا ہے۔

سچ بولنے کے لئے موقع کا انتظار نہ کیجئے۔ ہر وقت سچ بولیے، بلکہ سچ بولنے کو اپنی عادت بنالیجئے۔ تبھی آپ سچے آدمی کہلائیں گے۔

آپ کا دوست ظفر محمود شیخ

حمدِ باری تعالیٰ

ضیغم حمیدی

اے میرے سچے سائیں، جاہ و جلال والے
انداز ہیں کرم کے سب سے ترے نرالے
خالق ہے تو جہاں کا، مالک ہے آسماں کا
تو نے عطا کئے ہیں ہم سب کو تر نوالے
تیرے ہی دم قدم سے سارے ہیں عیش میرے
تو ہی مصیبتوں کو آدم کے سر سے ٹالے
یہ بحر و بر بھی تیرے، شمس و قمر بھی تیرے
بکھرے پڑے ہیں ہر سو تیرے ہی سب اُجالے
تیرے ہی دم سے میری روزی میں برکتیں ہیں
کرتا ہے تو ہی میرے نقصان کے ازالے
احساں ہے مجھ پہ تیری کتنی ہی نعمتوں کا
دل بھی ترے حوالے، جاں بھی ترے حوالے
تو ہے رحیم داتا، تو ہے کریم مولا
عصیاں کو میرے سارے دامن میں تو چھپا لے
تیرے حضور مالک ضیغم کی یہ دعا ہے
ظالم کو اس جہاں سے چُن چُن کے تو اٹھا لے

تاریخ اسلام کی

ایک حیرت انگیز شخصیت

محمد بن مالک

کشتی، دریا کی پرسکون لہروں پر اپنے منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ صبح کا وقت تھا۔ مسافروں میں سے کچھ لوگ ابھی تک سو رہے تھے، جبکہ بیدار ہونے والے عرشے پہ کھڑے، دور تک پھیلے ہوئے پانی کا نظارہ کر رہے تھے۔ لیکن یہ سکون شاید زیادہ دیر کے لئے نہیں تھا۔ کشتی میں اس وقت اچانک ہلچل مچ گئی جب ایک آدمی نے شور مچا دیا۔

"لوگو، میں لٹ گیا، برباد ہو گیا۔" لوگوں نے پوچھا کہ کیا ہوا۔ اس آدمی نے روتے پیٹتے بتایا "رات کو جب میں سویا تھا تو میرے پاس ایک ہزار اشرفیوں کی ایک تھیلی تھی جو کہ میں گھر سے لے کر چلا تھا، لیکن اب وہ تھیلی میرے سامان میں سے غائب ہے۔" باہم صلاح و مشورے کے بعد کشتی کے سرکردہ لوگوں نے سب مسافروں کی تلاشی لینا شروع کر دی، مگر کسی کے بھی پاس وہ تھیلی برآمد نہ ہو سکی۔ وہ آدمی بڑا حیران و پریشان ہوا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے ایک کونے میں بیٹھے

ہوئے ایک معصوم صورت اور نورانی چہرے والے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے سب سے زیادہ اسی پہ شک ہے۔ کیونکہ کل یہ میرے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور اسے میں نے اپنی تھیلی کے متعلق بتایا بھی تھا۔ اس کی دوبارہ تلاشی لو۔"

نوجوان کی دوبارہ تلاشی لی گئی مگر اس کے پاس تھیلی ہوتی تو ملتی۔ اس آدمی کی حیرت اور بڑھ گئی۔ وہ سوچنے لگا کہ کل ہی اس نوجوان نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے پاس ایک ہزار اشرفیوں کی تھیلی ہے اور اس نے مجھے وہ تھیلی دکھائی بھی تھی۔ میں نے اس سے تھیلی ہتھیانے کے لئے بڑی اچھی ترکیب استعمال کی ..... مگر وہ اس کے پاس سے آخر گئی کہاں؟ نوجوان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ جب سفر تمام ہوا تو وہ آدمی تنہائی میں اس نوجوان سے ملا اور اس سے پوچھا کہ تم نے وہ تھیلی کیا کی؟ نوجوان نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "دریا میں پھینک دی تھی۔" آدمی کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا، پوچھا "اتنی بڑی رقم تم نے دریا میں کیسے پھینک دی؟" نوجوان نے کہا "میری ساری زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی جمع و ترتیب میں گزر گئی۔ میری علمی دیانت اور پاکیزگی ضرب المثل بن گئی۔ کیا چوری کا شبہ اپنے اوپر لے کر اس دولت کو پامال کر دیتا جو میں نے زندگی کے قیمتی سال خرچ کر کے حاصل کی ہے؟"

یہ نوجوان جس کے چہرے پر علم کا نور پھیلا ہوا تھا، امام المحدثین محمدؒ بن اسماعیل بخاری تھے، جن کے علمِ حدیث میں رتبے کو ساری دنیا مانتی ہے۔ امام بخاریؒ کو بچپن سے ہی حدیث کا بے انتہا شوق تھا۔ جب بھی کوئی حدیث سنتے اسے فوراً یاد کر لیتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی تخلیق صرف حدیث کے لئے ہی کی ہے۔

آپ ۱۳ شوال ۱۹۴ھ کو بخارا میں پیدا ہوئے۔

کم عمری کے زمانے سے ہی امام بخاریؒ نے حصولِ علمِ حدیث کے لئے دور دراز کے سفر کرنا شروع کر دیئے تھے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے بڑا حیرت انگیز حافظہ اور ذہن عطا فرمایا تھا جس کے بل بوتے پر آپ نے علمی میدانوں میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ حاشد بن اسماعیلؒ نامی ایک بزرگ فرماتے ہیں، "امام بخاری ہمارے ساتھ بخارا کے علما کے پاس حدیث کی تعلیم حاصل کرنے جایا کرتے تھے۔ اس وقت وہ بالکل نو عمر تھے۔ ہم سب لوگ حدیث کو لکھتے اور یاد کرتے مگر امام بخاریؒ ایک لفظ نہ لکھتے اور خاموش بیٹھے رہتے۔ ساتھی ان کو کہتے کہ جب تم لکھتے نہیں تو تمہیں یہاں آنے کی ضرورت کیا ہے؟ کئی روز یونہی گزر گئے۔ ایک روز امام بخاریؒ نے ساتھیوں کی ملامت سے تنگ آکر کہا، لاؤ اپنے اپنے کاغذات نکالو اور دکھاؤ تم لوگوں نے کیا لکھا ہے! ہم اس وقت پندرہ ہزار سے زائد حدیثیں لکھ چکے تھے۔ ہم نے اپنے کاغذات امام بخاریؒ کی سامنے لاکر رکھ

دیئے۔ امامؒ نے تمام حدیثیں بھری مجلس میں زبانی سنا دیں اور ہم نے جان لیا کہ جو نایاب خزانہ ہمارے کاغذوں میں ہے وہ امام بخاریؒ کے خدا داد حافظے میں محفوظ ہے۔"

آپؒ کے غیر معمولی حافظے کی قوت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپؒ کو کل چھ لاکھ حدیثیں (راویوں کی اسناد اور حدیثوں کے مکمل متن سمیت) یاد تھیں۔ اور ان حدیثوں کی تلاش اور حصول کے لئے آپؒ نے جو جدوجہد اور کاوشیں کیں وہ کسی بیان یا تعریف کی محتاج نہیں۔ علامہ فربریؒ فرماتے ہیں کہ "امام بخاریؒ رات کو پندرہ پندرہ اور بیس بیس مرتبہ اٹھتے چراغ روشن کرتے اور مطالعہ حدیث میں مشغول ہو جاتے۔ نیند کی شدت ہوتی تو ذرا آنکھ جھپکا لیتے مگر مطالعہ کا بے پناہ شوق نیند پر غالب آجاتا، پھر اٹھتے اور چراغ روشن کر کے کتاب بینی میں مشغول ہو جاتے۔" امام بخاریؒ کی اسی محنت اور عملی جدوجہد کے باعث انہیں کم عمری میں ہی دنیائے علمِ حدیث میں وہ مقام حاصل ہو گیا کہ بڑے بڑے علما، محدثین اور اساتذہ تک ان کے پاس علم حدیث سیکھنے کے لئے آنے لگے اور ہر طرف ان کے فضل و کمال کا شہرہ عام ہو گیا۔

علامہ دارمیؒ امام بخاریؒ سے عمر میں بہت بڑے تھے، مگر فرمایا کرتے تھے کہ ہم میں سب سے بڑے عالم،، سب سے بڑے فقیہہ، سب سے زیادہ علم کے شیدا اور سب سے زیادہ جفاکش امام بخاریؒ ہیں۔

ابراہیم خواصؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابوذرعہؒ جیسے جلیل القدر عالم کو امام بخاریؒ کے سامنے بچوں کی طرح حدیث معلوم کرتے دیکھا ہے۔

خود امام بخاریؒ کا قول ہے کہ جب میں نے "قضایائے صحابہؓ" کے نام سے ایک کتاب لکھی تو اس وقت میری عمر اٹھارہ سال تھی۔

اس زمانے میں محدثین کے ہاں یہ دستور تھا کہ حدیثوں کو جمع کرتے ہوئے وہ کمزور اور غیر مستند حدیثوں کو بھی لے لیا کرتے تھے۔ امام بخاریؒ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کوئی ایسا مجموعہ بھی ہو جس میں صرف صحیح احادیث ہوں۔ چنانچہ انہوں نے خود ہی اس عظیم کام کا بیڑا اٹھایا اور "جامع الصحیح البخاری" مرتب کر کے اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ صحیح بخاری صحت کے لحاظ سے قرآن شریف کے بعد بلاشبہ سب سے بہترین کتاب قرار دی گئی۔ یہ آپؒ کا وہ کارنامہ ہے جس پر حدیث پڑھنے والے رہتی دنیا تک فخر کرتے رہیں گے۔

"صحیح بخاری" کے علاوہ بھی امام بخاریؒ کی تقریباً ۲۲ اہم اور بلند پایہ تصانیف ہیں جو کہ دینی امور اور تاریخ اسلامی کے موضوعات پر مبنی ہیں۔

امام ابو عبد اللہ محمدؒ بن اسماعیل بخاری نے ۲۵۶ھ کو عید الفطر کی شب ۶۲ برس کی عمر میں شہر سمرقند میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

بہتر راستہ

سیما صدیقی

عید نام ہے مہمان داری اور خاطر داری کا۔ مگر شبیر صاحب کا عید منانے کا طریقہ بڑا منفرد تھا..... وہ اپنے اہل خانہ سمیت صبح صبح گھر پہ تالا ڈال کر عید منانے "آل خاندان بربادی ٹور" پہ نکل کھڑے ہوتے۔ اس طرح وہ مہمان داری اور عید کے لوازمات کی تیاری سے صاف بچ نکلتے۔ یوں ان کی عید کی خوشیاں دوبالا اور متاثرین کی عید تہہ و بالا ہو کر رہ جاتی۔ کیوں کہ ان کے بچے بڑے جدت پسند واقع ہوئے تھے۔ جس گھر میں بھی جاتے، وہاں کی سیٹنگ سے کبھی مطمئن نہ ہوتے اور پوری سیٹنگ منٹوں میں بدل کر رکھ دیتے۔

ظفر صاحب کے ہاں یہ خاندان پہلی بار آیا تھا۔ ابتدائی آدھا گھنٹہ تو شبیر صاحب نے یہ باور کرانے میں صرف کیا کہ ان کی ظفر صاحب سے دور پار کی عزیز داری، محلے داری یا کم از کم جانکاری موجود ہے بالآخر ظفر صاحب کو ماننے ہی بنی۔ ظفر صاحب

کا خیال تھا کہ مہمان نہ صرف اپنے بچوں کو لائے ہیں بلکہ محلے یا ٹور کے دوران جو بچہ بھی ہاتھ لگا، وہ ساتھ لیتے چلے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق بچوں کی تعداد گیارہ تھی۔ ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ کہیں بارھواں بچہ ان کی باؤنڈری لائن پہ نہ بیٹھا ہو۔ ان بچوں نے گھنٹوں میں تیار کئے گئے عید کے پکوانوں کو منٹوں میں صاف کرنے کا حیرت انگیز مظاہرہ پیش کیا۔ بچوں کی والدہ نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا

"شرمانے کی کیا بات ہے، اپنا ہی گھر ہے!"

حالانکہ بچوں کو اس اضافی ہدایت کی بالکل ضرورت نہ تھی۔ وہ خود ہی اپنائیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرج تک رسائی حاصل کر چکے تھے اور اشیائے خورد و نوش سے خوب انصاف کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ کچھ تجسّس پسند بچے انڈے تک توڑ توڑ کر دیکھ رہے تھے کہ دیکھیں اس میں سے کیا نکلتا ہے؟

کچھ بچے بیڈروم میں پہنچ گئے تھے اور نامعلوم سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ ظفر صاحب کے ہاں اتنی نفری نہیں تھی جو وہ بچوں کی نگرانی پہ مامور کرتے، لہٰذا صبر کر کے بیٹھے رہے اور گاہے بگاہے بیڈروم سے چیزیں گرنے کی آوازیں سن کر پہلو بدلتے رہے۔ ایک بچہ البتہ ماں سے لگا چپ چاپ شرافت سے بیٹھا تھا اور بہت پیارا لگ رہا تھا۔ ظفر صاحب کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ بچہ شر اور آفت کی جمع ہے اور اس کی خاموشی کے پیچھے ایک طوفان چھپا ہے۔

جب خاندان کے سربراہ نے یہ محسوس کیا کہ ان کے بچے سیر حاصل عید منا چکے ہیں تو واپسی کا ارادہ ظاہر کیا۔ عین اسی وقت وہ خاموش فتنہ جاگ اٹھا اور کڑک کے بولا،

"امی یہ لوگ عیدی نہیں دیں گے کیا؟"

ظفر صاحب کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ بچے کی والدہ نے ہنستے ہوئے بچے کے سر پہ ہلکی سی چپت رسید کی اور بولیں "بڑا ہی شریر ہے!"

"اور ذہین بھی!" بچے کے والد نے بھی ستائش ضروری سمجھی۔

اصولاً بچے کے والدین کو شرمندہ ہونا چاہئے تھا اور بچے کو ٹوکنا چاہئے تھا مگر یہ ان والدین میں سے تھے جن کا خیال ہے کہ بچوں کو روکنے ٹوکنے سے ان کی نشوونما متاثر ہوتی ہے۔ (چنانچہ اس قسم کے بچے دوسروں کی املاک تباہ کرتے ہیں اور خوب پھلتے پھولتے ہیں۔)

والدین کے خفیہ اشارے پہ گھر کے مختلف کمروں سے سب بچے پلک جھپکتے میں نکل آئے اور عیدی کا مطالبہ کرنے لگے۔ ظفر صاحب کی بیگم جھینپ کے بولیں۔

"ارے دیکھو! باتوں میں خیال ہی نہ رہا..... نکالیں نا بچوں کی عیدی!" ظفر صاحب نے جونہی کرتے کی جیب سے پانچ روپے والی گڈی نکالی۔ وہی بچہ کرتہ پکڑ کر لٹک گیا اور بولا،

"انکل پانچ والے نہیں..... دس والے لیں

گے!"

بچے کے والد اس شر انگیزی پہ قہقہہ لگا کے بولے،

"بھئی بہت خوب، دیکھا آپ نے..... آج کل کے بچوں کو..... اور ایک ہم تھے۔ بچپن میں ہمیں نوٹ کی پہچان ہی نہ تھی۔"

ظفر صاحب نے محسوس کیا کہ اگر انہوں نے دس والی گڈی نہ نکالی تو انھیں کرتے سے ضرور ہاتھ دھونے پڑیں گے کیوں کہ بچہ بدستور کرتے سے لٹک رہا تھا۔ انہوں نے عیدی دینی شروع کی تو بچوں نے ایسا اودھم مچایا کہ ظفر صاحب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بعض بچوں کے درمیان اتنی مماثلت تھی کہ انہوں نے شک کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دو دو مرتبہ عیدی وصول کرلی۔

جب ان لوگوں نے حافظ خدا تمہارا کہہ کہ باہر کا رخ کر لیا اور ظفر صاحب کی بیگم نے اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ سب بچے باہر نکل چکے ہیں تو محتاط لہجے میں بولیں

"ارے کھانا ..... وانا ..... کھا کے جاتے!!"

ظفر صاحب نے گھبرا کر بیگم کو دیکھا۔ انہوں نے بہرحال ایک بڑا رسک لیا تھا، کیوں کہ یہ خاندان گیا وقت نہ تھا جو پلٹ کر نہ آتا۔ مگر شکر ہے کہ شبیر صاحب کے دل میں رحم آگیا، بولے

"ارے بہن ..... ذرا جلدی ہے ..... ورنہ کھانا ضرور کھاتے..... دراصل اسی محلے میں ہمارے ایک اور عزیز رہتے ہیں اگر وہاں نہ گئے تو شکایت ہو گی۔"

"اچھا!!! وہ کون صاحب ہیں؟" ظفر صاحب نے ازراہ ہمدردی ان کے اگلے شکار کا نام جاننا چاہا (گویا کہہ رہے ہوں، ہم کو تو برباد کیا ہے، اور کسے برباد کرو گے؟)

"ارے آپ انہیں نہیں جانتے!" شبیر صاحب نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"اچھا! تو آپ اپنے گھر کا پتا تو سمجھاتے جائیں، کل شاید ہم لوگ آپ کی طرف آئیں۔"

"وہ! کل شام کو تو ہم لوگ گھر پہ نہیں ہوں گے!" شبیر صاحب گڑبڑا کے بولے۔

"تو کوئی بات نہیں ..... ہم لوگ صبح صبح آجائیں گے۔" ظفر صاحب کے اس دھمکی آمیز لہجے پہ نہ صرف شبیر صاحب چپ سے ہو گئے بلکہ ظفر صاحب کی بیگم بھی حیران رہ گئیں۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ ظفر صاحب کے ذہن میں ایک خوفناک انتقامی منصوبہ جنم لے چکا ہے۔

ظفر صاحب نے تہیہ کر لیا کہ وہ کل بھانجے بھتیجوں کو جمع کریں گے اور بیگم کے ہمراہ ان کے گھر دھاوا بولیں گے مگر عین وقت پہ ان کی بیگم جانے کو تیار نہ ہوئیں اور بچوں نے بھی اجنبی گھر میں جانے سے صاف انکار کر دیا۔ ظفر صاحب نے اکیلے ہی وہاں کا رخ کیا۔ گو وہ اتنی تباہی تو نہیں مچا سکتے تھے، جتنی ان بچوں نے مچائی تھی (مثلاً ظفر

صاحب ان کے گھر کے انڈے نہیں توڑ سکتے تھے) مگر ان کے عید کے رنگارنگ پکوانوں کا صفایا تو کر ہی سکتے تھے۔ ظفر صاحب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ دو بھائیوں کے خاندان اوپر نیچے کی منازل میں رہائش پذیر ہیں۔ دل میں کہا، اچھا ہے ایک تیر سے دو شکار کریں گے۔ سویاں، شیر خرمہ جو بھی سامنے آیا ہڑپ کر جائیں گے اور ڈکار نہ لیں گے۔

جب انہیں شبیر صاحب سے گپ شپ کرتے آدھا گھنٹہ گذر گیا تو اہل خانہ نے ایک دوسرے کو پراسرار اشارے کرنا شروع کر دیئے۔ بالآخر خاتون خانہ اٹھیں اور ایک ڈش میں بہت سی سویاں لا کر ظفر صاحب کے سامنے رکھ دیں۔ ظفر صاحب نے ایک چمچہ سویاں منہ میں ڈالیں تو طبیعت صاف ہو گئی۔ غالباً پانی میں سویاں پکانے کا یہ پاکستان میں پہلا تجربہ تھا۔ یہ ابلتی گرتی سویاں ہائی پریشر ٹیکنالوجی کے فارمولے پہ تیار کی گئی تھیں اور وہ بھی دو ماہ چلنے کی مکمل گارنٹی کے ساتھ۔ ان سائنٹیفک اور غیر شاعرانہ سویوں کو پلیٹ میں ڈال کر ظفر صاحب برے پھنسے تھے۔ انہوں نے آہستگی سے پلیٹ واپس رکھنی چاہی تو شبیر صاحب بضد ہو گئے۔

"دیکھیں ظفر بھائی! عید کے دن ہم مہمانوں کو کچھ کھلائے پلائے بغیر نہیں بھیجتے، مہمان (زندہ یا مردہ) ہمارے ہاں سے بہرحال سویاں کھا کر ہی رخصت ہوتا ہے۔ ارے ذرا چکھیں تو سہی کیسی بنی ہیں؟"

آدم کی پہاڑیاں

○ سری لنکا کے مغرب میں چند پہاڑیاں ہیں جو آدم کی پہاڑیاں کہلاتی ہیں۔ ان پہاڑیوں کے قریب سورج، غروب ہونے سے پہلے سرخ رنگ میں تبدیل ہوتا ہے۔ اس کے بعد سرخ رنگ ہلکا پڑ جاتا ہے اور سبز رنگ ظاہر ہوتا ہے آخر اسی طرح سات رنگ بدلنے کے بعد سورج غروب ہو جاتا ہے۔

مرسلہ ...... محمد شاہ کھوکھرائی، ٹنڈو محمد خان

انہوں نے ایسے کہا جیسے ظفر صاحب کوئی لیبارٹری ہوں جو تجرباتی طور پر ان کی سویاں ٹیسٹ کر کے بتائیں کہ ان میں مہمانوں کو بھگانے کی کتنی صلاحیت پوشیدہ ہے؟ بمشکل تمام انہوں نے سویاں ٹھکانے لگائیں تو شبیر صاحب نے مزید سویاں ان کی پلیٹ میں ڈال دیں۔

"ارے ہماری بیگم کی سویوں کی تو شہر بھر میں دھوم ہے اور آپ ہیں کہ ناحق تکلف کر رہے ہیں!"

(اگر انہیں مفاد عامہ کا ذرا بھی خیال ہوتا اور انسانیت نام کی کوئی چیز بھی ان کے پاس ہوتی تو وہ اپنی بیگم اور ان کی سویوں کے متعلق اتنی ڈس انفارمیشن نہ پھیلاتے اور مہمانوں کو زبردستی یہ سویاں نہ ٹھنساتے)

ظفر صاحب نے نہ ایسی سویاں کبھی کھائی تھیں، نہ کھانے کی ہوس تھی۔ مگر یہ سویاں تو گلے پڑ گئی تھیں۔

"چلیں اب اوپر چلتے ہیں..... آپ کے بھائی کے ہاں!" ظفر صاحب نے یہ سوچ کر کہا کہ شاید اوپر کے حالات کچھ سازگار ہوں اور ان کا انتقامی پروگرام پورا ہو سکے۔ شبیر صاحب انہیں اوپر لے گئے۔ معلوم ہوا کہ ان کے بھائی بچوں سمیت "آل خاندان بربادی ٹور" پر نکلے ہوئے ہیں صرف ان کی بیگم گھر پر موجود تھیں۔ رسمی تعارف اور سلام دعا کے بعد انہوں نے انکشاف کیا کہ بچوں کے والد "بنگلہ دیش" سے خصوصی سویوں کا پیکٹ لے کر آئے ہیں، وہی پکائی ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے سائیڈ میں رکھی ہوئی ٹرالی گھسیٹ کر سامنے کر دی اور ڈش کا ڈھکن ہٹا دیا۔ ظفر صاحب نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ ان کے میاں سادگی میں سویوں کو جگہ پٹ سن کا پیکٹ لے آئے ہیں۔ موٹی موٹی رسیاں سویوں کی صورت میں ان کے سامنے پڑی تھیں۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والا معاملہ تھا، مگر مزاجاً یہ خاتون نیک دل تھیں ظفر صاحب کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ کر انہوں نے رحم کرنے کا فیصلہ کر لیا اور بولیں۔

"ویسے زینت (ان کی صاحبزادی) نے کیک بھی تیار کیا ہے، بھئی میں تو مذہبی تہوار پہ انگریزوں کے طور طریقے اختیار کرنے کے خلاف ہوں مگر زینت کی ضد تھی۔ ارے بھئی! زینت، ظفر انکل کو اپنا کیک تو چکھاؤ!"

زینت نے نہایت سلیقے سے ان کے سامنے ایک چھوٹے سائز کا سوٹ کیس رکھ دیا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ وہ سوٹ کیس ہی دراصل کیک تھا۔ ظفر صاحب نے چھری لے کر اسے تسخیر کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر یہ کیک مکمل طور پر "ان بریک ایبل" تھا۔ جب کیک ٹس سے مس نہ ہوا اور چھری لرز کر ٹوٹنے کے قریب ہو گئی تو ظفر صاحب نے ہتھیار ڈال دیئے (یعنی چھری پھینک دی) زینت نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ فریزر میں رکھنے سے کیک قدرے سخت ہو گیا ہے اور پھر دعویٰ کیا کہ وہ ایک خاص تکنیک سے کیک کے ٹکڑے ٹکڑے کر سکتی ہے۔ مگر ظفر صاحب نے اسے منع کر دیا کہ وہ یہ حیرت انگیز مظاہرہ کسی اور مہمان کے سامنے پیش کرے۔ انتقام کی آگ بجھانے کے لئے انہوں نے صرف ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا اور دل ہی دل میں مغربی تہذیب اور زینت، دونوں کو یکساں القابات سے نوازتے ہوئے گھر کی راہ لی اور جان لیا کہ انتقام لینے سے معاف کر دینا بدرجہ بہتر ہے۔

بہت بہت شکریہ

اس بار ہمیں بہت سے ساتھیوں کے عید کارڈز ملے۔ فرداً فرداً سب ساتھیوں کا شکریہ ادا کرنا ممکن نہ تھا اس لئے رسالے کی معرفت ان تمام ساتھیوں کا شکریہ ادا کر رہے ہیں جنہوں نے عید پر ہمیں اپنی خوشیوں میں اتنی چاہت سے یاد رکھا۔

(ادارہ)

آتا ہے یاد مجھ کو...

آتا ہے یاد مجھ کو پکنک کا وہ زمانہ
دریا کنارے جا کر وہ چھٹیاں مناتا
تنہا شکار کرنا ، تنہا شکار کھانا
پانی میں کود جانا اور دیر تک نہانا
اک واک مین لے کر اک ہیڈ فون لے کر
گھٹنوں پہ ہاتھ باندھے پتھر پہ بیٹھ جانا
اور جھوم جھوم سُننا فاختہ کے دوہے
بُلبُل پری کی غزلیں ، کوّے میاں کا گانا
مستی میں چُور ہو کر ، محوِ سُرور ہو کر
سر کو کبھی ہلانا ، دھیرے سے گنگنانا
اب بھی کبھی اگر ہو دریا کنارے جانا
"آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ"

م۔ الف۔ راشد

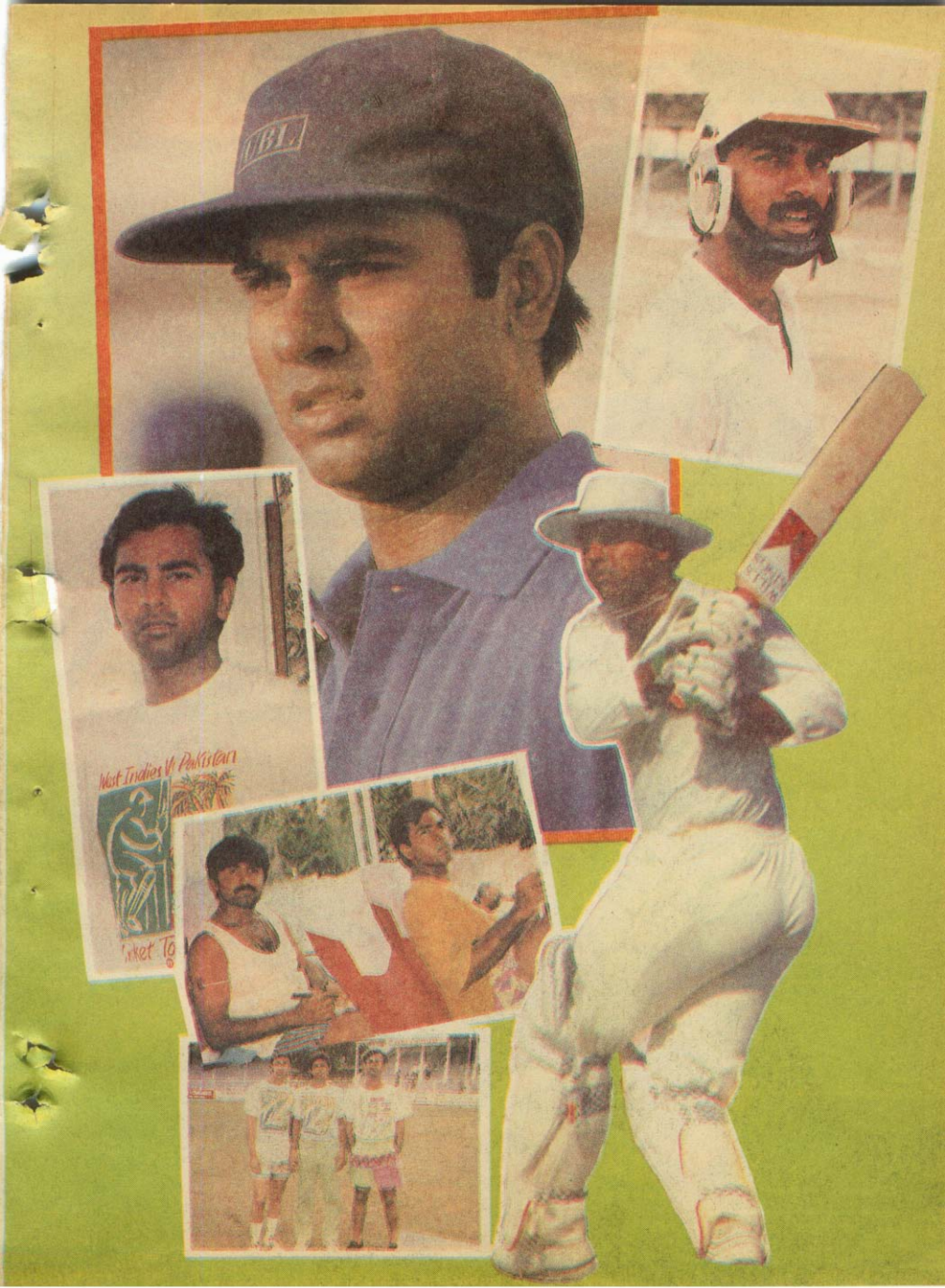

UBL
West Indies V Pakistan

مستقبل کے میانداد

انٹرویو: سلیم خالق

- ویسٹ انڈیز میں کھیل کر کیریئر کی ابتدا کرنا نئے کھلاڑی کے لئے اچھا ہے۔
- میری بیٹنگ میں میاں داد کی جھلک ہے تو یہ میرے لئے فخر کی بات ہے۔
- سینئر کھلاڑیوں میں جاوید میاں داد، وسیم اکرم اور وقار یونس نے بڑی حوصلہ افزائی کی۔
- جب چھوٹا تھا تو گھر والے دھوپ میں کھیلنے سے منع کرتے تھے۔
- کورٹنی والش کی گیند کو کھیلنے میں تھوڑی سی مشکل پیش آئی۔
- دس رن بناؤں یا دو سو، مزا تب ہے جب ٹیم جیتے۔
- شارجہ کپ کے فائنل میں مشکل حالات میں سینچری تو بنالی لیکن میچ ہار گئے جس کا بے حد افسوس ہے۔

باسط علی ملنسار اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ حالانکہ شہرت حاصل ہو جانے کے بعد بہت سے لوگ مغرور ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ میرے سامنے پیش آیا۔ ایک لڑکا جو باسط کا مداح تھا، ان سے ملنے آیا لیکن جب باسط سے ملاقات ہوئی تو وہ لڑکا گھبراہٹ کے مارے کچھ بول نہ سکا۔ باسط نے لڑکے کی گھبراہٹ کا اندازہ کر لیا۔ ہنس کر اس سے کہنے لگے "بھائی میرے بھی دو ہاتھ، دو پاؤں ہیں، میں بھی آپ ہی کی طرح ہوں۔" ان کے چند جملوں نے لڑکے کی گھبراہٹ دور کر دی اور اس لڑکے نے پھر باسط سے بہت سی باتیں کیں۔

باسط کے کھیل میں اسٹائل، خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ ساتھ بے پناہ اعتماد بھی ہے۔ پھر ان کے کھیلنے کا انداز کافی حد تک جاوید میاں داد کے انداز سے مِلتا جُلتا ہے جس کی وجہ سے انہیں مستقبل کا میاں داد قرار دیا جا رہا ہے۔

باسط علی ۱۲ دسمبر ۱۹۷۰ء کو کراچی کے ایک گنجان علاقے جیکب لائن میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۸۵ء میں اپنے فرسٹ کلاس کیریئر کا آغاز کیا اور شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ باسط علی کی بدقسمتی کہ ان کے اچھے کھیل کے باوجود انہیں پاکستانی ٹیم

میں شامل ہونے کے لئے ایک صبر آزما انتظار کرنا پڑا۔ بالآخر ۱۹۹۲ء کے دورۂ ویسٹ انڈیز میں انہیں پاکستانی ٹیم میں شامل کر لیا گیا اور باسط نے اپنی شمولیت کو صحیح..... ثابت کر دکھایا جب انہوں نے ون ڈے اور ٹیسٹ میچوں میں عمدہ کھیل پیش کیا اور کرکٹ کے شائقین سے داد و تحسین وصول کی۔ حال ہی میں شارجہ کپ کے فائنل میں انہوں نے مشکل وقت میں نہایت ذمہ دارانہ اور دلیرانہ بیٹنگ کرتے ہوئے شاندار سنچری اسکور کی۔

آنکھ مچولی کے لئے باسط کی رہائش گاہ پر یہ گفتگو ہم نے ریکارڈ کی جو آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

سوال : باسط بھائی! آپ اتنے عرصے سے ڈومیسٹک کرکٹ میں عمدہ کارکردگی دکھا رہے تھے لیکن آپ کا نام ٹیم میں نہیں آتا تھا۔ کبھی آپ کو مایوسی تو ہوئی ہوگی، کبھی آپ کو یہ خیال بھی آیا ہوگا کہ بیکار ہے کرکٹ چھوڑ دینی چاہئے؟

باسط : جی ہاں! میں بہت محنت کرتا تھا لیکن پھر بھی قومی ٹیم میں کبھی نام نہیں آتا تھا۔ اس لئے مایوسی تو بہت ہوئی تھی لیکن چونکہ میں بینک کے لئے کھیلتا ہوں اور پروفیشنل ہوں اس لئے کرکٹ چھوڑنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ پھر بھی اللہ پر پورا یقین تھا کہ میں کبھی نہ کبھی ٹیسٹ کرکٹ ضرور کھیلوں گا۔

سوال : آپ کو پہلی سیریز ویسٹ انڈیز جیسی مضبوط ٹیم کے خلاف ملی۔ ویسٹ انڈیز کے فاسٹ بولرز کو کھیلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے جب کوئی نیا کھلاڑی ان کے خلاف کھیلتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ اسکا کیریئر یہیں ختم ہو گیا۔ آپ کے لئے بھی لوگوں نے ایسی باتیں کہی تھیں تو لوگوں کی باتیں سُن کر آپ کو کبھی گھبراہٹ محسوس ہوئی؟

باسط : جی نہیں گھبراہٹ تو محسوس نہیں ہوئی کیونکہ میں پہلے ہی ویسٹ انڈیز میں جو میچز ہوئے ہیں اس کی ویڈیو ٹی وی پر دیکھتا رہا ہوں۔ مجھے تھوڑا بہت آئیڈیا تو ہو گیا تھا ویسے مجھے آسٹریلیا اور ویسٹ انڈیز کی کرکٹ کا ماحول بہت پسند ہے۔ اور جب نیا لڑکا وہاں جائے اور سائڈ میچز وغیرہ میں رنز کر لے تو اس کے لئے مشکل نہیں رہتی، اعتماد آ جاتا ہے۔ میرے خیال میں ویسٹ انڈیز میں کھیل کر کیریئر کی ابتدا کرنا نئے کھلاڑی کے لئے زیادہ اچھا ہے۔ اور جہاں تک بات کیریئر بگڑنے کی ہے تو یہ بات تو اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہے عزّت دے اور جسے چاہے ذلّت دے۔

سوال : اس دورے کی اپنی کوئی اننگ آپ کو پسند آئی؟

باسط : "سینٹ ونسنٹ" میں جو میں نے ۶۰ رنز اسکور کئے تھے وہ اننگ اور "گیانا" میں ۵۷ رنز کی اننگ مجھے بہت اچھی لگی۔

سوال : اس دورے میں سینئر کھلاڑیوں نے کس حد تک آپ کی رہنمائی کی؟

باسط : سینئر کھلاڑیوں میں جاوید بھائی (جاوید میاں داد) نے میری بہت مدد کی۔ وہ مجھے نیٹ پریکٹس کراتے تھے..... اور بتاتے تھے کہ کس بولر کو کس

طریقے سے کھیلنا ہے۔ اس کے علاوہ وسیم بھائی (وسیم اکرم) ہیں..... اگر میں نے کوئی غلطی کی بھی تو انہوں نے کچھ نہیں کہا بلکہ پیار ہی سے سمجھایا۔ اور وقار یونس ہیں۔ انہوں نے میری اس دورے میں بہت مدد کی۔

سوال :اپنی پہلی ٹیسٹ اننگ میں جب آپ صفر پر آؤٹ ہوئے تو آپ کی کیا کیفیت تھی؟

باسط :اس وقت میری جو حالت تھی وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں انتہائی افسردہ تھا اور مایوس بھی۔ پھر وقار میرے پاس آئے اور انہوں نے سمجھایا تو میں نارمل ہوا۔

سوال :ابتدائی تعلیم آپ نے کون سے اسکول سے حاصل کی؟

باسط :جی۔ بی۔ ایس۔ ایس۔ اسکول۔ یہ اسکول ہمارے علاقے جیکب لائن ہی میں ہے اور مجھے اس پر ناز ہے کہ میں نے یہاں سے پڑھا ہے۔

سوال :کرکٹ تو آپ اچھے ہیں طالبعلم کیسے تھے؟

باسط :اسکول کی حد تک تو بہت اچھا تھا مگر جب اسلامیہ سائنس اور اردو آرٹس کالج میں پہنچا تو پھر کھیل کی وجہ سے پڑھائی کچھ متاثر ہوئی اور چوں کہ میں ساری توجہ کھیل پر ہی مرکوز رکھنا چاہتا تھا اس لئے پھر پڑھائی پر دھیان ہی نہ دے سکا۔

سوال :بچپن میں کرکٹ کھیلنے پر گھر والے منع تو کرتے ہوں گے؟

باسط :جی نہیں کبھی منع نہیں کیا البتہ صرف دھوپ میں کھیلنے سے منع کرتے تھے لیکن جب میں انڈر ۱۹ ٹیم میں پہنچا تو یہ روک ٹوک بالکل ختم ہو گئی۔

سوال :اب تک آپ نے جتنی کرکٹ کھیلی ہے اس میں سب سے اچھا بولر کونسا لگا آپ کو اور کس بولر نے آپ کو پریشان کیا؟

باسط :دیکھیں جی! مشکل بولر وہ ہوتا ہے جس کا رِدھم بنا ہوتا ہے۔ ویسے اب تک میں نے جتنی کرکٹ کھیلی ہے اس میں مجھے کورٹنی والش کی گیند کھیلنے میں ذرا سی مُشکل پیش آئی ہے کیوں کہ ان کا بولنگ رِدھم خاصا اچھا ہے۔

سوال : آپ کو اس مقام تک لانے میں کن لوگوں نے اہم کردار ادا کیا؟

باسط :میرے بڑے بھائی واجد علی صاحب، میرے دوست واصف شکور، سید شکور احمد (مرحوم) اور ہمارے کلب کے کوچ مجید صاحب اور ان کے علاوہ ٹیم میں لانے کے لئے وقار یونس نے بڑی مدد کی۔

سوال : آپ کتنے بھائی بہن ہیں؟

باسط :جی! ہم چھ بھائی اور چار بہنیں ہیں؟

سوال : آپ کے کسی اور بھائی کو بھی کرکٹ کھیلنے کا شوق ہے۔

باسط :جی ہاں واجد بھائی کو ہے اور انہی کو کھیلتا دیکھ کر مجھے بھی کھیلنے کا شوق ہوا۔

سوال :قومی ٹیم میں آپ کے بہترین دوست کون کون ہیں؟

باسط :راشد، معین، ندیم، آصف، انضمام وغیرہ۔

سوال : کرکٹ کے علاوہ کوئی اور کھیل جو آپ کو پسند ہے ؟

باسط : جی ہاں ! ہاکی مجھے بہت پسند ہے ۔

سوال : کوئی ایسا کارنامہ جسے انجام دینے کو دل چاہتا ہو ؟

باسط : کارنامہ یہ ہے کہ بس ٹیم جیتے چاہے میں اسے جتانے کے لئے دس رن بناؤں یا دو سو ۔

سوال : شارجہ کپ کے فائنل میں آپ نے جو شاندار اننگ کھیلی اس کے بارے میں کچھ بتائیں ؟

باسط : بس جی اللہ نے عزّت رکھ لی، اس کی مہربانی تھی، کہ مشکل حالت کے باوجود میں نے ۷۲ رنز اسکور کئے لیکن بدقسمتی سے میچ ہار گئے اس لئے زیادہ مزا نہیں آیا ۔

سوال : آنکھ مچولی کے قارئین کے لئے آپ کا پیغام ؟

باسط : پیغام یہ ہے کہ کرکٹ ہو یا کوئی اور کھیل کھیلیں ضرور لیکن ساتھ ساتھ پڑھیں بھی کیوں کہ تعلیم بہت ضروری ہے ۔ تعلیم انسان کو اچھا بناتی ہے ۔ اور اس کی شخصیت کو سنوارتی ہے ۔

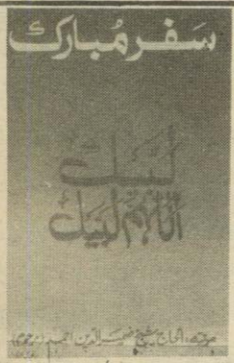

عازمینِ حج

متوجّہ ہوں

خوش نصیب ہے وہ شخص جسے اللہ نے حجازِ مُقدّس کے سفر کے لیے منتخب کرلیا ۔
اِس سال فریضۂ حج کی ادائیگی پر جانے والے تمام حجّاج کی خدمت میں ضمیرالدّین میموریل آرگنائزیشن ایک ایسا تحفہ پیش کررہی ہے جو سفرِ حج اور مناسکِ حج کے دوران اُن کے لیے بہترین زادِراہ ثابت ہو گا ۔
جناب شیخ ضمیرالدّین احمد (مرحوم) کی تالیف کردہ کتاب "سفرِ مُبارک" بلا قیمت حاصل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل پتے پر ایک خط اپنی حج کی دستاویزات کی فوٹوکاپی کے ساتھ، ارسال کیجیے ۔ ہم یہ کتاب آپ کو ارسال کردیں گے ۔

پتا : ماہنامہ آنکھ مچولی ۔ ضمیرالدین میموریل آرگنائزیشن ، 1 ۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۔ پوسٹ کوڈ 74800

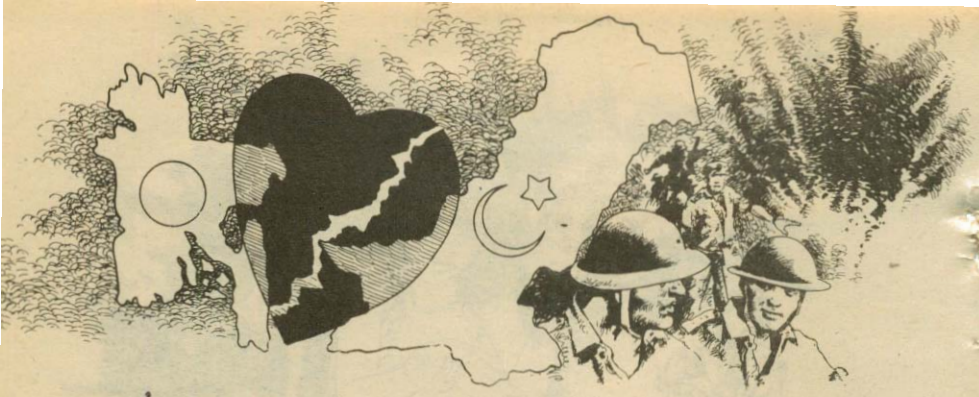

اے میرے وطن

سعدیہ یاسمین

اے میرے وطن، اے میرے چمن   کھِلتے تھے جہاں گُل اور سمن
تیری ہی جبیں سے پھُوٹی تھی   خوشیوں کی یہاں اک روز کِرن
وہ روپ بھی دیکھا ہے تیرا   تھا امن کی پریوں کا مسکن
اغیار کی سازش سے لیکن   دو لخت ہوا ہے تیرا بدن
سُکھ چین تِرا سب چھین لیا   ہے رنج و الم سے پُر دامن
ہر غم کو بہا کر لے جائے   باقی نہ رہا وہ سازِ کہن
اس پاک زمیں پر کیوں آئے   یہ بغض و تعصّب، رنج و محن
یہ بیج عناد و نفرت کے   کانٹوں کی طرح ہے جن کی چُبھن
آنکھوں سے مِری ہیں اشک رواں   زخموں سے بھرا ہے تیرا بدن

پیاری بیٹی

آصف فرخی

۲۸ ستمبر ۱۹۸۳ء کو یورپ اور امریکا کے بہت سے اخباروں نے یہ خبر بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ شائع کی کہ گرم برادران کی تحریر کردہ، بچوں کی ایک کہانی دریافت ہوئی ہے۔ اس کہانی کی دریافت کی خبر ساری دنیا میں پھیل گئی۔ ویلہم گرم اور یاکوب گرم دو بھائی تھے جنھوں نے انیسویں صدی میں جرمنی میں جنم لیا۔ دونوں بھائی لوک ادب کے عالم تھے اور انھوں نے اپنے ملک میں گھوم پھر کر وہ کہانیاں اکٹھی کیں جو صدیوں سے سنائی جارہی ہیں۔ گرم برادران کی جو کہانی دریافت ہوئی ہے اس کا ترجمہ آنکھ مچولی کے پڑھنے والوں کے لئے پیش کیا جارہا ہے۔

پیاری ملی،

مجھے یقین ہے کہ تم درختوں کے کنج میں یا ہری بھری چراگاہوں میں سیر کرنے کے لئے گئی ہو اور تم کسی گنگناتی بہتی ندی کے پاس سے گزری ہو اور تم نے اس ندی میں کوئی پھول اچھالا ہے، سرخ پھول، نیلا پھول یا برف کی طرح اجلا، سفید پھول۔ وہ پھر پانی کے ساتھ بہتا گیا اور تم آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کے پیچھے پیچھے چلتی رہیں، جہاں تک تمہاری نظر کام کرتی تھی۔ اور وہ پھول چپ چاپ، پانی کے ساتھ بہتا گیا، دور ہوتا گیا۔ سارا دن اور

ساری رات بہتا چلا گیا، چاند اور ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں بہتا رہا۔ اسے زیادہ روشنی کی ضرورت بھی نہیں تھی، اس لئے کہ اسے راستہ معلوم تھا اور وہ گم نہیں ہو سکتا تھا۔ ستائے یا آرام کئے بغیر تین دن تک مسلسل سفر کرنے کے بعد اس کی ملاقات ایک اور پھول سے ہوئی جسے ایک اور ندی میں اچھالا گیا تھا۔ تمہاری جیسی کسی اور بچی نے یہاں سے بہت دور، عین اسی وقت وہ پھول ندی میں اچھالا تھا۔ دونوں پھولوں نے ایک دوسرے کو چوما، ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے، یہاں تک کہ ندی میں ڈوب کر ختم ہو گئے۔ تم نے ایک ننھی سی چڑیا کو پہاڑوں کی طرف شام کے وقت اڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ شاید تم یہ سمجھی ہو کہ یہ چڑیا بسیرا کرنے جا رہی ہے۔ لیکن یہ بات نہیں تھی۔ ایک اور ننھی سی چڑیا دوسرے پہاڑوں پر سے اڑتی ہوئی آ رہی تھی اور جب ساری دنیا پر رات کا اندھیرا چھانے لگا تو دونوں چڑیاں سورج کی آخری کرنوں کی روشنی میں ملیں۔ کرنوں سے ان کے پر چمکنے لگے اور دونوں چڑیوں نے چونچ سے چونچ ملا کر ایک دوسرے کو بہت سی ایسی باتیں بتائیں جو ہم دنیا میں رہنے والے کبھی نہ سن سکیں گے۔ تم جانو کہ ندیاں اور پھول اور چڑیاں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ لیکن لوگ ایک دوسرے کے پاس اس طرح نہیں آتے۔ بڑے بڑے پہاڑ اور دریا جنگل اور چراگاہیں شہر اور گاؤں ان کے درمیان آتے ہیں۔ پھر ان سب کی جگہیں طے ہیں اور ہم اپنی جگہ بدل نہیں سکتے۔ ہم ندیوں کے ساتھ بہہ نہیں سکتے، بادلوں کے ساتھ اڑ نہیں سکتے۔ لیکن ایک انسان کا دل، دوسرے انسان کی طرف رخ کرتا ہے اور درمیان کے فاصلوں سے نہیں رکتا۔ اسی طرح میرا دل تمہارے پاس آتا ہے۔ میری آنکھوں نے اب تک تمہیں نہیں دیکھا ہے، لیکن میرا دل تم سے پیار کرتا ہے اور یوں سمجھتا ہے کہ تمہارے پاس موجود ہے۔ پھر تم کہتی ہو "مجھے کہانی سناؤ" اور میرا دل کہتا ہے "ہاں، پیاری بچی، ذرا سنو تو سہی......"

کسی زمانے میں ایک گاؤں کے بالکل سرے پر ایک بیوہ عورت رہا کرتی تھی۔ اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا، سوائے ایک چھوٹے سے مکان اور مکان سے ملحق باغیچے کے۔ اس کا کوئی بچہ جیتا نہ رہا تھا۔ سوائے ایک لڑکی کے، جس سے وہ بہت محبت کرتی تھی۔ یہ لڑکی بہت پیاری اور اچھی بچی تھی، جو ہمیشہ اپنی ماں کا کہنا مانتی تھی، اور ہر روز صبح اٹھ کر ...... اور پھر سونے سے پہلے خدا سے دعا مانگتی تھی کہ اسے نیکی کی توفیق دے۔ اس لڑکی کے ہر کام میں سلیقہ تھا۔ پھر وہ جو کچھ کرتی، تو بگڑے کام بھی سنور جاتے۔ جب وہ مکان کے ساتھ والے باغیچے میں کوئی پودا لگاتی، تو پودا جلد ہی جڑ پکڑ لیتا اور پھر پھولوں سے بھر جاتا۔ جب لڑکی پر کوئی مصیبت آتی تو وہ اس خطرے سے بچ نکلتی اور اس کی ماں دل ہی دل میں سوچا کرتی کہ میری ننھی بچی کی نگرانی کوئی فرشتہ کرتا ہے اور یہ جہاں جہاں جاتی ہے، اس کے ساتھ

رہتا ہے، اس کی حفاظت کرتا ہے۔

خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ان کی یہ سادہ اور پیار بھری زندگی جاری نہ رہ سکی اور ان کے ملک میں ہولناک جنگ چھڑ گئی۔ ایک دن، ماں بیٹی دونوں اپنے گھر کی دہلیز پر بیٹھی ہوئی تھیں کہ انہوں نے افق کے اس پار دھوئیں کا گہرا، کالا بادل اٹھتے دیکھا، اور ذرا دیر بعد ساری زمین توپوں کی گھن گرج سے دہل کر رہ گئی۔ ہزاروں لاکھوں لوگوں کے چیخنے پکارنے کی آوازیں فاصلے کی وجہ سے دھندلی سنائی دے رہی تھیں۔ "یا خدا!" ماں نے گھبرا کر کہا۔ "یہ کیسی بلا آئی ہے! پیاری بچی، میں تمہیں ظالم لوگوں سے کیسے بچاؤں؟"

پھر ڈر کے مارے اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی بچی کو جنگل میں بھیج دے، جہاں کوئی دشمن اس تک نہ پہنچ سکے۔ اس نے پچھلے دن کی باسی روٹی کے تین ٹکڑے بچی کی جیب میں رکھ دیئے اور اس سے کہا۔

"آؤ میری بچی! میں تمہیں جنگل میں لے جاؤں گی۔ تم سیدھے چلتی رہنا۔ تم یہاں محفوظ رہو گی۔ تین دن انتظار کرنا، پھر تیسرے دن گھر لوٹ آنا خدا تم پر فضل کرے گا اور تمہیں راستہ دکھا دے گا۔"

وہ بچی کو جنگل تک لے کر آئی۔ اس کا ماتھا چوما، پھر اسے جانے دیا۔

اب تم سمجھو کہ اکیلے رہ جانے پر اس بچی کا کیا حال ہوا ہو گا۔ وہ جنگل کے اندر چلتی چلی گئی۔ صنوبر کے اونچے اونچے درختوں کی چوٹیوں کو طوفانی ہوا ہلا رہی تھی، اور جب اس کا دامن کانٹے دار جھاڑیوں سے الجھتا تو وہ ڈر کے مارے کانپنے لگتی کیونکہ اسے لگتا کہ کسی وحشی جنگلی درندے نے اسے پکڑ لیا ہے، اور اسے پھاڑ کھائے گا۔ جنگل میں کھٹ بڑھئی، کوّے، چیلیں اور عقاب شور مچا کر آسمان سر پر اٹھائے ہوئے تھے اور ہر قدم پر پتھروں سے اس کے نازک پیر لہولہان ہو جاتے۔ وہ ڈر کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھی اور وہ جتنا آگے بڑھتی جاتی، اس کا ڈر بڑھتا جاتا۔ آسمان پر بھی اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ آسمان کے نیل کا آخری نشان بھی مٹ گیا اور طوفانی ہوا کے زور سے ٹہنیاں چیخ کر ٹوٹنے لگیں۔ اس کے دل پر چھایا ہوا سہم اتنا بڑھ گیا کہ اس سے ایک قدم نہیں اٹھ سکا۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گئی، اور دعا مانگنے لگی۔

"خدایا! مجھے آگے بڑھنے کا راستہ دکھا۔"

اس نے دعا مانگی تو جیسے اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی۔ اور اس نے دل ہی دل میں کہا۔

"آسمان اور میرا دل ساتھ ساتھ رو رہے ہیں۔" پھر وہ بیٹھی رہی یہاں تک کہ بارش کی جھڑی بند ہو گئی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی اور آسمان کی طرف دیکھا تو سفید سفید بادل اڑے جاتے تھے اور سورج چمک رہا تھا۔ سورج کی دھوپ سے بادلوں کے کنارے گلابی ہو رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ خدا اپنے آسمانی گلے کی بھیڑوں کو گلاب کے پھول دے رہا ہے، مجھے کیوں بھول گیا؟ اور وہ

اسی راستے پر چلتی رہی۔ شاید کوئی فرشتہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا جو اسے راستے کی مشکلوں سے نمٹنے کا طریقہ سمجھاتا جارہا تھا۔ شاید اس فرشتے نے ایک سفید فاختہ بھیجی ہو جو اس بچی کے آگے آگے اڑتی جاتی ہو اور اسے راستہ دکھاتی جاتی ہو۔

رات ہوئی تو وہ ایک میدان میں پہنچ گئی جہاں نہ کانٹے دار جھاڑیاں تھیں اور نہ نوکیلے پتھر۔ بس نرم نرم گھاس تھی، جس سے اس کے زخمی پیروں کو بڑا سکون ملا۔ پھر اس نے ستاروں کو ایک ایک کر کے نکلتے دیکھا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "آسمان کے پھاٹک پر جڑی یہ کیلیں کیسی چمک دار ہیں! جب خدا یہ دروازہ میرے لئے کھولے گا تو کیسی خوشی ہوگی"۔ پھر ایسا لگا جیسے ایک ستارہ زمین پر اتر آیا ہے۔ وہ اس ستارے کی طرف بڑھی، اور اس کی روشنی کا حلقہ بڑھنے لگا۔ بڑھتے بڑھتے پھیل گیا۔ اس نے قریب پہنچ کر دیکھا تو ایک گھر تھا اور روشنی اس کی کھڑکی سے پھوٹ رہی تھی۔

بچی نے دروازے پر دستک دی اور آواز آئی۔

"اندر آجاؤ!"

وہ اندر چلی گئی اور اس نے اندر جا کر دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی وہاں بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے بڑے مہربان لہجے میں کہا۔

"پیاری بچی، یہ تم ہی ہو! میں بہت دنوں سے تمہارے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔"

اس کی سفید داڑھی تھی جو زمین تک پہنچتی تھی، اور اس کا بھریوں بھرا، بوڑھا چہرہ شفقت بھرا لطر آتا تھا۔

"بیٹھ جاؤ، پیاری بچی۔" اس نے کہا۔

"تم تھک گئی ہوگی۔ آتش دان کے پاس اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ اور آگ تاپ لو۔" بچی وہاں بیٹھ گئی۔

بوڑھے نے پھر کہا۔ "تم بھوکی اور پیاسی ہوگی۔ میں تمہیں پینے کے لئے صاف پانی دوں گا۔ مگر کھانے کے لئے میرے پاس جنگلی جڑی بوٹیاں ہیں اور تمہیں ان کو پکانا پڑے گا۔"

بچی نے وہ جڑی بوٹیاں اٹھالیں۔ انہیں دھویا، صاف کیا اور اپنی جیب میں پڑی ہوئی روٹی کا ٹکڑا بھی ان میں ڈال دیا۔ جب کھانا پک گیا تو بوڑھے نے کہا۔

"مجھے بھوک لگی ہے مجھے بھی دو۔" اس پیاری بچی نے جتنا کھانا اپنے لئے رکھا، اس سے زیادہ بوڑھے کو دے دیا۔ لیکن جتنا کھایا، اس سے اس کا پیٹ بھر گیا۔

"کھانا ختم ہوا تو بوڑھے نے کہا۔ "اب تمہیں نیند آرہی ہوگی۔ میرے گھر میں ایک ہی بستر ہے تم اس پر سو جاؤ۔"

بچی نے کہا۔ "زمین پر تھوڑا سا بھوسہ بچھا دیں۔ میں اس پر لیٹ رہوں گی۔"

لیکن بوڑھے نے اس کی بات نہیں مانی۔ گود میں اٹھا کر اسے بستر پر لٹا دیا اور چادر اوڑھا دی۔

صبح سویرے اس کی آنکھ کھلی تو بوڑھا اس کے

سرہانے بیٹھا ہوا تھا۔ اور کھڑکی میں سے دھوپ چمک رہی تھی۔

"پیاری بچی۔" بوڑھے نے اس سے کہا۔ "اٹھو! اب کام کا وقت ہے جنگل میں جاؤ اور کھانے کے لئے جڑی بوٹیاں چن کر لاؤ۔"

وہ اٹھی اور خوش خوش باہر چلی آئی جہاں اتنی چڑیاں تھیں کہ اس نے کبھی دیکھی بھی نہیں تھیں اور اتنے بڑے بڑے، خوب صورت رنگوں والے پھول کھلے تھے کہ اس نے اپنی ساری زندگی میں ایسے پھول کبھی نہ دیکھے تھے۔

جب وہ درختوں کے سائے میں ہری بھری گھاس پر گھوم رہی تھی تو اچانک اس کی نظر پڑی کہ ایک چھوٹی سی بچی اس کے پاس کھڑی ہے۔ یہ جو دوسری بچی تھی، آگے آئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر جنگل کی وہ جگہیں دکھانے لے گئی جہاں پھل اور ان پودوں کی جڑیں ملتی تھیں، جن کو کھایا جا سکتا تھا۔ جب کافی ساری چیزیں جمع ہو گئیں تو وہ دوسری بچی اس کے ساتھ کھیلنے لگی، اس کے لئے پھول چُنے۔ اس دوسری بچی کے بال سنہری تھے اور اس نے سرخ لباس پہن رکھا تھا۔ دیکھنے میں دونوں بچیاں بالکل ایک جیسی تھیں اور ان میں فرق کرنا خاصا مشکل تھا۔ صرف ایک فرق تھا کہ دوسری بچی کی آنکھیں زیادہ روشن تھیں۔ کہیں یہ بچی ہی اس کی نگرانی کرنے والا فرشتہ تو نہیں تھی؟ جڑی بوٹیاں دامن میں بھر کر وہ گھر پہنچی، کھانا پکایا اور ایک بار پھر بوڑھے کو کھلایا۔

تیسرے دن بھی یہی ہوا۔ جوں ہی وہ گھر سے باہر آئی دوسری بچی پہلے سے موجود تھی۔ دونوں مل کر کھیلتی رہتیں۔ کتنی دیر ہو جاتی، نہ اکتاہٹ ہوتی نہ وقت گزرنے کا احساس۔ تیسرے دن بچی نے روٹی کا آخری ٹکڑا بھی بوڑھے کو کھانے کو دیا۔ کھانا کھا کر بوڑھے نے کہا۔

"پیاری بچی، اب تمہیں اپنی ماں کے پاس واپس چلا جانا چاہئے۔ یہاں پر تمہارے قیام کی مدت پوری ہو چکی ہے۔"

بچی نے کہا۔ "جی ہاں! اب میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ لیکن میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ یہاں پھر واپس آؤں۔"

بوڑھے نے گلاب کی ادھ کھلی کلی اس کے سامنے رکھ دی۔ "ایسا ضرور ہو گا، جب یہ کلی کھل کر پورا گلاب بن جائے تب، تم میرے پاس چلی آؤ گی۔"

بچی دروازے سے باہر آئی تو دوسری بچی وہاں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ دوسری بچی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس سے کہا۔ "میں تمہیں واپسی کا آسان راستہ دکھاتی ہوں۔ جلد ہی تم اپنی امی کے پاس پہنچ جاؤ گی۔ لیکن تمہیں یہ سفر مشکل معلوم ہو گا۔"

دونوں بچیوں نے چلنا شروع کیا۔ جب چلتے چلتے تھک جاتیں تو دوسری بچی مدد کرتی۔ سارا سفر اسے خود طے کرنا پڑا۔ ایک جگہ راستہ اتنا دشوار تھا کہ اس سے آگے نہ چلا گیا۔ اس نے گھبرا کر کہا۔

"کاش کوئی ایسی چیز ہوتی جس سے میں تازہ دم ہو جاتی۔ ورنہ امی کو دیکھنے سے پہلے بے ہوش ہو کر نہ گر پڑوں۔"

دوسری بچی نے پگڈنڈی کے ساتھ اگا ہوا ایک پھول توڑا جو پیالے کی شکل کا تھا۔ اس میں ذرا سا رس ٹپکا کر اسے پلایا وہ تازہ دم ہو کر پھر چلنے لگی۔

چلتے چلتے جنگل ختم ہوا۔ دوسری بچی نے گاؤں کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

"اب تم خود آگے بڑھو۔"

بچی آگے بڑھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن دوسری بچی کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

بچی گاؤں میں داخل ہوئی مگر گاؤں اسے اجنبی اور نامانوس لگ رہا تھا۔ جو گھر اس کے دیکھے بھالے تھے ان میں نئی نئی صورتیں نظر آ رہی تھیں۔ راستے بھی مختلف تھے اور راستوں کے ساتھ اُگے ہوئے درخت بھی اور جنگ نے جو تباہی مچائی تھی اس کا بھی نام و نشان نہیں تھا۔

گاؤں میں ہر طرف امن چین تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ گھاس نرم نرم تھی، درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ کیا یہ وہی گاؤں تھا؟

اس نے اپنی امی کا گھر فوراً پہچان لیا۔ لیکن گھر کے پاس آئی تو دیکھا ایک بوڑھی عورت، سر جھکائے دہلیز پر بیٹھی ہے اور ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں سے دھوپ سینک رہی ہے۔

بوڑھی عورت نے سر اٹھا کر بچی کو دیکھا، پھر حیرت اور خوشی سے چیخ پڑی۔ "ارے میری پیاری بچی! خدا نے میری سن لی ..... میں مرنے سے پہلے تمہیں ایک بار دیکھ سکتی ہوں!"

ماں نے بچی کو سینے سے لگا لیا۔

بچی کو تب معلوم ہوا کہ اس نے جنگل میں بوڑھے، مقدس بزرگ کے ساتھ تیں برس گزارے ہیں جن کو وہ تین دن سمجھ رہی تھی۔ اس کی ماں گاؤں میں جنگ کے دنوں میں بڑی مصیبت میں مبتلا رہی، مگر وہ ان مشکلوں سے بچ گئی۔ اس کی ماں یہ سمجھ رہی تھی کہ جنگل کے جانوروں نے اسے مار ڈالا ہو گا، پھر بھی اس کی خواہش تھی کہ بس ایک دفعہ اپنی پیاری بچی کی ایک جھلک دیکھ لے جسے اس نے اپنے ہاتھوں سے جنگل میں بھیج دیا تھا۔

ماں نے خواہش کی تھی کہ اس کی پیاری بچی کی وہی جھلک نظر آ جائے جب وہ جنگل میں گم ہو گئی تھی، اور عین اسی وقت بچی سامنے آ گئی۔ وہی صورت، وہی ناک نقشہ، وہی لباس، جیسے تیں سال گزرے ہی نہیں تھے۔

ساری شام دونوں بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ پھر بڑے سکون کے ساتھ اور ہنسی خوشی سونے کے لئے اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئیں، اور اسی حالت میں پڑوسیوں نے ان کو مردہ پایا۔ وہ دونوں ہمیشہ کی نیند سو چکی تھیں اور پیاری بچی کے سرہانے مقدس بزرگ کی دی ہوئی ادھ کھلی کلی تھی جو، اب پورا گلاب بن چکی تھی۔

عربوں کا ایٹم بم

علی جبران

"ایٹم بم" موجودہ دور کا سب سے خوف ناک ہتھیار ہے۔ اسے صرف دو مرتبہ ہیرو شیما اور "ناگاساکی" پر آزمایا گیا ہے۔ جس سے ہزاروں آدمی ہلاک، لاکھوں زخمی اور اپاہج ہوگئے۔ پچھلے وقتوں میں بھی ایسی ایجادیں ہوتی رہیں جن کے متعلق لوگوں کا وہی خیال تھا جو آج کل کے "ایٹم بم" کے متعلق ہے۔

ان میں سے وہ آتش گیر روغن "نفطہ" خاص طور پر قابل ذکر ہے جو عربوں نے تیار کیا تھا، اور صلیبی جنگوں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ انگریزوں نے اسے "گریک فائر" یعنی "یونانی آگ" کا نام دیا۔ اس روغن کے آگ پکڑنے کا نظارہ پہلے پہل انہوں نے قسطنطنیہ میں دیکھا تھا جو اس وقت یونانی شہر تھا۔

اس روغن کو مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا تھا۔ تیروں کی نوک پر روغن مل دیا جاتا جو ہوا لگتے ہی آگ پکڑ لیتا اور دشمنوں کی صفوں میں بھگدڑ مچا دیتا۔ اسی سے راکٹ نے جنم لیا۔ دوسرا طریقہ اس روغن کو بڑی بڑی پچکاریوں میں بھر کر

پھینکنے کا تھا۔ کمان کی شکل کا ایک ایسا آلہ بنایا گیا تھا جسے توپ کی طرح زمین پر نصب کر لیتے تھے۔ اس کی مار "منجنیق" سے بھی زیادہ تھی۔ اسی کے ذریعے "روغن نفطہ" دور دور تک پھینکا جاسکتا تھا۔

تیروں کے ذریعے آتش بازی کا سلسلہ تو عربوں نے پہلے دور ہی میں شروع کر دیا تھا۔ محمد بن قاسم نے سندھ کی جنگ میں ایسے تیر اندازوں سے کام لیا تھا جن کے تیر، کمان سے نکلتے ہی سراپا آگ بن جاتے تھے۔ بعد میں آتش گیر روغن سے کام لینے کا فن بہت ترقی کر گیا۔ صلیبی جنگوں میں عربوں نے یہ روغن استعمال کیا تو عیسائیوں پر خوف وہراس طاری ہو گیا۔ وہ اس قدر دہشت زدہ ہو گئے کہ اس آگ کو دیکھتے ہی پناہ کے لئے برجوں کے اندر گھس جاتے، لیکن آگ ایسی خوفناک ہوتی کہ برج بھی اس کی تپش سے بچانے میں ناکام ثابت ہوتے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ آگ کو پانی سے فوراً بجھایا جاسکتا ہے لیکن اس آگ پر جب پانی ڈالا جاتا تو یہ اور بھڑکتی۔ یہ روغن مٹی کے تیل سے تیار کیا جاتا تھا۔ لیکن اس میں کئی کیمیکل ایسے ملا دیئے جاتے تھے جن سے اس کی حرارت بے پناہ تیز ہو جاتی تھی۔

یہ روغن بری و بحری دونوں قسم کی لڑائیوں میں یکساں استعمال ہوتا تھا۔ عربوں نے اپنے جہازوں میں جابجا بڑی پچکاریاں لگا رکھی تھیں جن میں سے کسی کی شکل شیر کی سی، کسی کی شکل اژدھے کی مانند اور کسی کی گھڑیال (مگرمچھ) کی طرح ہوتی تھی۔ دشمن کے جہازوں پر یہ روغن پڑتے ہی ان میں آگ لگ جاتی تھی اور وہ جل کر خاکستر ہو جاتے تھے۔

ہوا میں تیر یا روغن پھینکنے سے "قوس" جیسی حرکت پیدا ہوتی تو ساتھ ہی روغن آگ پکڑ لیتا۔ پہلے پہل ایک دھماکہ سا ہوتا۔ پھر سیاہ دھواں نکلتا اور اسی میں سے شعلے نمودار ہوتے۔ اگر یہ آگ رات کو برسائی جاتی تو سارا کیمپ روشن ہو جاتا۔ لوگ گھبرا گھبرا کر اوندھے منہ گر جاتے اور آستینوں سے سر چھپا لیتے۔ آگ ہوا میں اڑتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ لمبی دم والا "پردار آتشیں اژدھا" ہوا میں اڑتا چلا آرہا ہے۔

یہ آج سے آٹھ صدی پہلے کا "ایٹم بم" تھا جو عربوں کی ایجاد تھی۔

روتا ہوا مجسمہ

○ لندن میں ایک مجسمہ سترہویں صدی سے رو رہا ہے یہ ڈاکٹر "ایڈورڈ ڈاکنگ" کا مجسمہ ہے جس کو پتھر سے تراشا گیا اس کی خاصیت یہ ہے کہ ہوا کی نمی کو جذب کر لیتا ہے جب نمی زیادہ ہو جاتی ہے تو مجسمے کی آنکھوں سے پانی ٹپکنے لگتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ مجسمہ رو رہا ہے۔

مرسلہ ..... محمد شاہ کھوکھرائی، ٹنڈو محمد خان

انوکھی شرارت

صبا امروز

بچپن میں ہم اپنی شرارتوں کی وجہ سے خاصے مشہور تھے۔ اسکول میں داخل ہوئے تو ہم نے اسکول گیر شہرت حاصل کر لی۔ پہلے پہل تو ہم اپنی نت نئی شرارتوں کا تجربہ ہم جولیوں پر کرتے رہے مگر پھر جب معلوم ہوا کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

تو یہ سلسلہ آگے بڑھا لیکن یہ شرارتیں تکلیف دہ ہونے کے بجائے دلچسپ ہوا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ ہمیں ایک بالکل انوکھی شرارت سوجھی جسے آزمانے کے لئے مس افشاں کا انتخاب کیا۔ مس افشاں ایک پیاری اور خوش اخلاق خاتون تھیں۔ عمر رسیدہ۔ بھاری بھرکم اور خوش مزاج۔ ہم نے اپنی ہم جولیوں کو وقفے میں اپنے پسندیدہ مرکز کے نیچے جمع کیا۔ یہ مرکز ایک درخت تھا۔ گھنٹی بجتے ہی ڈولی،

عظمیٰ، صائمہ اور شبانہ درخت کے نیچے ہمارے انتظار میں کھڑی ہو گئیں۔

"ہاں تو میری عزیز بہنو! آج ہم ایک بالکل نئی شرارت کریں گے۔ سائنسی شرارت" یہ کہتے ہوئے ہم نے مٹھی کھول کر بھائی جان کی میز سے اڑائے ہوئے مقناطیس کو نکالا جو طاقت ور ہونے کی وجہ سے کافی دور کی چیزیں کھینچ لیتا تھا۔

"یہ مقناطیس مس افشاں پر استعمال ہو گا۔" ہم نے اعلان کیا۔ پھر ہم نے تفصیل کے ساتھ اپنا منصوبہ سمجھایا۔ تو لڑکیوں کا ہنسی کے مارے برا حال ہو گیا۔ مس افشاں اپنے بالوں کو کریم رول کی طرح لچھے دار بنا کر اس پر ہیر پنیں اٹکا دیا کرتی تھی۔ ان کا یہی فیشن ہمیں پسند آیا تھا۔

چوتھے پیریڈ میں مس افشاں کلاس میں داخل ہوئیں۔ غیر معمولی خاموشی کو محسوس کر کے انہوں نے اپنی عینک کے پیچھے سے پوری کلاس کا جائزہ لیا اور ہمیں گھورتے ہوئے بورڈ کو صاف کرنے کا حکم دیا۔ ہم انتہائی معصوم صورت بنائے مقناطیس ہاتھ میں دبائے اٹھے اور مس کو مصروف پا کر اپنا کام صفائی سے انجام دیا۔ مقناطیس ان کے سر کے قریب پہنچا تھا کہ ایک ایک کر کے تمام بال پنیں نکلنی شروع ہو گئیں اور کریم رول مس کی گردن پر جھولنے لگا۔

لڑکیوں نے ہنسی روکنے کے لئے منہ میں رومال ٹھونس لئے۔ تمام ہیر پنیں اپنے قبضے میں کر کے ہم چپکے سے اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ گردن پر بالوں کو لٹکتے ہوئے محسوس کر کے مس افشاں نے گھبرا کر بالوں کو چھوا اور تعجب اور پریشانی کے عالم میں کلاس سے باہر نکل گئیں۔ لڑکیاں بے تحاشا ہنس رہی تھیں۔ ہم بھی دبے پاؤں اسٹاف روم کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں مس رخسانہ نے مس افشاں کو اس حالت میں دیکھا تو بے ساختہ مسکرا دیں۔

"مس رخسانہ! پتہ نہیں کیا قصہ ہے صبح میں نے اپنے ہاتھوں سے سر پر ہیر پنیں لگائی تھیں۔ مگر اب سب غائب ہیں۔"

"بھلا ایسا لگتا ہے شاید آپ لگانی بھول گئی ہوں۔" مس رخسانہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولیں۔

"ناممکن!" مس افشاں نے جواب دیا۔

"خیر آپ پھر سے لگالیں۔" اور وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ مس افشاں پھر بال بناتے ہوئے کلاس میں آئیں اور کاپیاں کھولنے کا حکم دیا۔ ہم مس کو پنسل دینے کے بہانے اٹھے اور اڑائی ہوئی پنیں آہستہ سے کرسی کے نیچے گرا کر ایک بار پھر مقناطیس لے کر پاس کھڑے ہو گئے۔ ایک سیکنڈ کے وقفے میں تمام پنیں پھر ہمارے قبضے میں تھیں اور بال مس افشاں کی گردن پر جھول رہے تھے۔ اس بار ان کی حالت پہلے سے عجیب تھی۔ وہ سہمے ہوئے انداز میں خلا میں گھورنے لگیں جیسے وہاں کوئی غیر مرئی طاقت چھپی ہو۔ لڑکیوں نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔

"لڑکیو! لڑکیو! اللہ کے لئے چپ ہو جاؤ۔"

وہ اور زیادہ بے تابی سے بال ٹٹولنے لگیں۔ "مس دیکھئے! آپ کی کرسی کے نیچے کیا پڑا ہے؟" ہم ہنستے ہنستے چلائے۔ انہوں نے جھک کر پنوں کو دیکھا اور اٹھا کر تیزی سے اسٹاف روم کو چل دیں۔ ہم بھی پیچھے ہولئے۔ مس رخسانہ اس مرتبہ مس افشاں کو دیکھ کر کھلکھلا دیں لیکن وہ سخت حیران بھی تھیں۔

"یہ بار بار آپ کے بال کیوں گر رہے ہیں؟" انہوں نے کہا۔

"اوہ رخسانہ! میری سمجھ میں خود نہیں آرہا ہے۔"

مس رخسانہ نے پوچھا "شرارت ہاں یہ ضرور شرارت ہے۔ جبھی سیما بار بار میرے پاس آرہی تھی۔" وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ ہم باقی باتیں سنیں بغیر کلاس کی طرف بھاگ لئے۔ لڑکیوں نے شاباش کا نعرہ لگایا ہی تھا کہ مس اندر داخل ہوئیں اور سیدھی میرے پاس آئیں۔

"لڑکیو! بھئی کیا بات ہے؟" انہوں نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" ہم بولے۔

"مس افشاں کی پنیں کس نے نکالیں؟"

"پتا نہیں۔" ہم نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔

"اچھا آؤ میرے ساتھ!"

ہم نہایت فرماں برداری کے ساتھ چل دیئے۔ اسٹاف روم میں جب انہوں نے نرمی سے

بھیڑ کی کمر پر گھاس

ایک جرمن باشندے ولیم لارڈ کے پاس ایک ایسی بھیڑ تھی جس کی کمر پر برسات کے موسم میں اس طرح گھاس اگ آتی تھی جیسے میدان میں۔ اس نے کئی بار گھاس کو منڈوایا مگر اس کے اگنے میں کوئی فرق نہ آیا جب بھیڑ کی کمر پر نئی گھاس اگ آتی تو ولیم اس عجیب و غریب بھیڑ کو عوام کے سامنے پیش کر کے بذریعہ ٹکٹ سینکڑوں روپے کماتا۔

مرسلہ ...... یاسر بن نثار، راولپنڈی

پیٹ میں تجوری

برطانیہ کے ایک ہسپتال میں پیٹ کے درد کا ایک مریض داخل ہوا جب اس کے پیٹ کا ایکسرے لیا گیا تو پیٹ میں ایک شکل تجوری کی مانند نظر آئی جس میں ہر قسم کے سکے موجود تھے آپریشن کے بعد اس کے پیٹ میں سے ۴۶۴ سکے برآمد ہوئے۔

مرسلہ ...... محمد عمر سومرو، خیرپور سادات۔

پوچھا تو ہم نے سب کچھ سچ سچ اگل دیا۔ اور مٹھی کھول کر مقناطیس بھی دکھایا۔ وہ بے اختیار مسکرا دیں۔ انہوں نے ہمیں ڈانٹ کر جانے کا حکم دیا او ہم فاتحانہ شان سے کلاس میں داخل ہوئے، لیکن جب تک مس افشاں کا پیریڈ ختم ہو چکا تھا۔ بعد میں مس افشاں بھی حقیقت معلوم ہونے پر ناراض نہ ہوئیں بلکہ ہماری انوکھی شرارت پر صرف مسکرا دیں۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

عمران احمد

میچ زوروں پر تھا اور فضا تالیوں کی آواز سے گونج رہی تھی۔ کھلاڑی بڑے انہماک سے کھیل رہے تھے۔ تماش بین اشتیاق سے دیکھ رہے تھے اور ننھا "جاشیہے" بڑی پھرتی سے سائیڈ لائن کراس کر جانے والی گیند کو واپس کھلاڑیوں کی طرف منتقل کر رہا تھا۔ یہ کیلیفورنیا اسٹیٹ یونیورسٹی کا باسکٹ بال کورٹ تھا جہاں یونیورسٹی کی ٹیم ایک دوسری مقامی ٹیم سے میچ کھیلنے میں مصروف تھی۔ کھلاڑی، تماشائی اور بال بوائز سب ہی اپنی جگہ مگن تھے کہ اچانک "جاشیہے" کی نظر ایک وہیل چیئر پر پڑی جس پر ایک سیاہ فام نوجوان بیٹھا بڑی حسرت سے کھلاڑیوں کو کھیلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ آنسوؤں کے دو قطرے اسکی پلکوں پر اسکے صاف چمک رہے تھے "جاشیہے" ٹھٹھک کر رک گیا۔ وہ "جان فلاورز" کو پہچان گیا تھا۔ وہی کیا، وہاں موجود تقریباً ہر شخص جان فلاورز کو جانتا تھا کیونکہ وہ کچھ عرصہ پہلے تک اسٹیٹ یونیورسٹی کا بہت اچھا اور مقبول کھلاڑی رہ چکا تھا۔ اس نے اپنے زمانے میں یونیورسٹی کیلئے بہت سے اعزازات جیتے تھے۔ پھر ہوا یوں کہ کار کے ایک حادثے میں اسکی دونوں ٹانگیں ضائع ہو گئیں اور وہ مستقل طور پر وہیل چیئر کا محتاج ہو گیا۔ اب وہ باسکٹ بال نہیں کھیل سکتا تھا لہٰذا یونیورسٹی کی ٹیم سے اسے الگ کر دیا گیا۔ اور اسکے ساتھ ہی وہ وظیفہ بھی بند ہو گیا جو ایک کھلاڑی کی حیثیت سے یونیورسٹی اسے دیا کرتی تھی وظیفے کی یہ رقم "فلاورز" کی پڑھائی کے علاوہ دیگر ضروریات پوری کرنے میں بھی کام آتی تھی مگر اسکے بند ہو جانے کی وجہ سے فلاورز کافی مشکلات میں گھر گیا تھا۔ اسکا اور کوئی ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ یہ بات "جاشیہے" کو بھی معلوم تھی۔ اسے "فلاورز" کو اس حالت میں دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ اس نے سوچا کہ فلاورز کی مشکلات کا کچھ حل ضرور ہونا چاہیئے مگر وہ خود تو بارہ سال کا ایک بچہ تھا۔ وہ بھلا کیا کر سکتا تھا لیکن اس نے سوچا کہ "خود اسے ہی کچھ کرنا چاہیئے"۔ بالآخر اس نے ایک منصوبہ بنایا اور فائنل میچ والے وقفے کے دوران ایک باسکٹ لے کر وہاں موجود تمام کھلاڑیوں، اسٹاف اور تماشائیوں سے اپیل کی کہ وہ "فلاورز" کیلئے چندہ دیں۔ "جاشیہے" کے جذبے کو دیکھتے ہوئے لوگوں نے بھی دل کھول کر عطیات دیئے اور مختصر سے وقت میں پندرہ ہزار ڈالر (تقریباً ساڑھے چار لاکھ پاکستانی روپے) جمع ہو گئے۔ یوں ایک ننھے بچے کے نیک جذبات نے ایک بڑا کام کر دکھایا۔ "جان فلاورز" نے جذبات میں رندھی ہوئی آواز میں کہا:

"یہ بظاہر ایک ناممکن کام تھا۔ میں لوگوں کا ممنون ہوں۔ خاص طور پر ننھے "جاشیہے" کی محنت اور محبت کا... جس نے میرے لیئے یہ کام کیا۔"

انڈے بول اٹھے!

بعض شرارتیں سنجیدہ بھی ہوتی ہیں۔ اب ان انڈوں ہی کو لیجئے۔ ان پہ کیسی ہنستی مسکراتی منہ بسورتی اور طرح طرح کی شکلیں بنی ہوتی ہیں۔ یہ ساری شرارتیں آسٹریا کے ایک شخص ہیرنشیل کی ہے ۔۔ اسے انڈوں پہ ہر قسم کی تصویر بنانے میں بڑی زبردست مہارت حاصل ہے۔ ہیرنشیل آسٹریا ہی میں پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑھا۔ اس کا کہنا ہے کہ انڈے پہ پینٹنگ بنانے کی شرارت میری ایجاد نہیں ہے ۔۔ بلکہ ہمارے ملک میں یہ رواج بہت شروع سے چلا آرہا ہے کہ لوگ انڈوں کو ڈیکوریٹ کرتے ہیں۔ میرے دادا بچپن میں مجھے ایسے گاؤں کے بارے میں بتایا کرتے تھے جو صرف انڈوں پہ پینٹنگ کرنے کے حوالے سے مشہور تھے پھر جب میں خود بال بچوں والا ہوا تو میں نے اس رواج کو زندہ کرنا چاہا۔ چنانچہ اب میں نہ صرف خود یہ کام کرتا ہوں بلکہ اسکول کے بچوں کو یہ فن سکھاتا بھی ہوں ۔

ہیرنشیل کے پینٹ کیے ہوئے انڈے بڑے مقبول ہیں۔ اشتہاری کمپنیاں، رسائل مشہور شخصیات اس سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ وہ سب اس سے اپنی اپنی ضرورت کی تصویریں انڈوں پہ بنواتے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ کسی نے انڈے پہ چوہے کی تصویر بنوائی ہے کسی نے کتے کی اور کسی نے گڈے گڑیوں کی۔ اگر ہماری ملاقات کبھی ہیرنشیل سے ہوئی تو ہم انڈے پر اس مرغی کی تصویر بنوائیں گے جس نے وہ انڈہ دیا ہوگا۔ دیکھئے نا! ان انڈوں پہ سب سے زیادہ حق تو مرغیوں ہی کا ہوا نا! ہیرنشیل ان انڈوں پہ تصویریں کیسے بناتا ہے؟ یہ ہم آپ کو بتانا چاہ رہے تھے لیکن "شرارت نمبر" کی وجہ سے کہیں آپ اسے شرارت نہ سمجھ لیں اس لیے پھر سہی۔

آگلوسیصیکیری بو

سیّد عدنان یوسف

آپ نے بدو کے خیمے میں اونٹ والا لطیفہ سنا ہو گا۔ ایک بدو نے دھوپ کی تمازت اور شدت سے بچنے کے لئے خیمہ لگایا اور اندر بیٹھ گیا۔ اس کا اونٹ باہر تھا۔ گرمی جیسے انسان کو لگتی ہے اسی طرح جانور کو بھی۔ چنانچہ دھوپ نے ستایا تو اونٹ نے بھی اپنی گردن اندر کرلی۔ بدو نے اونٹ سے کہا "کیا کرتا ہے کم بخت" اونٹ نے کہا۔ "آقا! اگر مجھے ذرا سی جگہ مل جاتی تو میں بھی آپ کی طرح دھوپ کی تمازت سے بچ جاتا۔" بدو کو رحم آگیا اور اس نے اونٹ کو اجازت دے دی اور اونٹ پورا کا پورا خیمے میں گھس آیا۔ ظاہر ہے خیمے کا جو حشر ہوا ہو گا وہ آپ کو معلوم ہی ہے۔ لیکن میں آپ کو جو واقعہ بتا رہا ہوں وہ ریگستانِ عرب کا نہیں، قطب شمالی کے قریب گرین لینڈ کا ہے۔ جہاں سارے

سال برف پڑتی ہے۔ یہاں کے رہنے والے اصل باشندے اسکیمو ہیں جو برف سے گھر بناتے ہیں۔ ان گھروں کو اگلو کہتے ہیں۔

یہ موسم گرما کی صبح تھی۔ آپ کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ قطب شمالی میں چھ مہینہ کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے۔ موسم گرما میں جب چھ ماہ کا طویل دن ہوتا ہے تو سورج مسلسل چمکتا رہتا ہے کبھی غروب نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہاں کے رہنے والے سونے کے لئے ان اوقات کا تعین کر لیتے ہیں جب سردی زیادہ ہو۔ یعنی سورج سفر کر کے افق پر رک جائے۔ ایسی ہی ایک صبح میں نے گڑگڑاہٹ کی آواز سنی۔ ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ شاید برفانی طوفان آنے والا ہے۔ لیکن اس موسم میں اور اس مقام پر برفانی طوفان کم آتے ہیں۔ پھر میں جس اِگلو میں ٹھہرا تھا وہ ہواؤں سے بچاؤ کے لئے ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں تھا۔ میں گڑگڑاہٹ پر غور کر ہی رہا تھا کہ اب مجھے زمین بھی ہلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

"یا خدا! کیا یہ زلزلہ آرہا ہے"؟ میں لیٹے لیٹے سوچ رہا تھا۔ گڑگڑاہٹ کی آواز نے ذیشان کی نیند بھی اچاٹ کر دی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لیکن آلرک کی نیند گہری تھی۔ وہ مسلسل خراٹے لے رہا تھا۔ ذیشان نے آلرک کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ اتنی دیر میں گڑگڑاہٹ قریب آچکی تھی۔ پھر یوں محسوس ہوا کہ جیسے ہمارا اگلو بنیادوں سے اکھڑ رہا ہے۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ البتہ سامنے والی دیوار میں ایک شگاف پیدا ہوا اور اس میں سے ایک کیری بو کا سر اندر داخل ہو گیا۔

کیری بو دراصل ایک قطبی ہرن ہے۔ ہرن ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ یہ کوئی خوبصورت اور معصوم جانور ہو گا۔ جی نہیں! اس کے سر پر نوکیلے سینگوں کا سہرا اس کا سب سے خطرناک ہتھیار ہے۔ جس کے سامنے ٹھہرنے کی ہمت قطبی ریچھ بھی نہیں کر پاتا جو قطبی خطوں کا بادشاہ ہے۔

کیری بو کو جھانکتے دیکھ کر آلرک نے ایک چیخ ماری اور زور سے چلّایا۔ دہشت اور خوف سے لبریز اسکیمو زبان کے چند جملے بھی ہماری سمجھ نہیں آسکے۔ وہ غالباً ہم لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ ہم جان بچا کر اِگلو سے باہر نکل جائیں لیکن ہم اسکیمو زبان نہیں جانتے تھے۔ آلرک کو انگریزی آتی تھی لیکن خوف اور دہشت میں ہر آدمی اپنی مادری زبان بولتا ہے اور اسی وجہ سے آلرک بھی انگریزی کے بجائے اسکیمو زبان میں چلّا رہا تھا۔

اتنی دیر میں کیری بو کی گردن پوری کی پوری اگلو کے اندر داخل ہو چکی تھی اور اس کے خوفناک سینگ اگلو میں مزید تباہی پھیلانے میں مصروف تھے۔ اس کی خوفناک سرخ آنکھیں ہمیں گھور رہی تھی اور وہ سینگ ہلا ہلا کر مزید اندر گھسنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

آلرک کی چیخ و پکار سے زیادہ کیری بو کی خوفناک چیخوں نے ہمیں دروازے کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ہم جس وقت دروازے سے باہر

نکل رہے تھے اتنی دیر میں پورا کیری بو اگلو کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ آلرک نے باہر نکل کر اگلو کا دروازہ بند کر دیا۔ تاکہ کیری بو اس راستے سے باہر نہ نکل سکے۔ لیکن اس دروازے کی کیری بو کے سینگوں کے سامنے کوئی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ اتنی دیر میں دوسرے لوگ بھی ہمارے اگلو کے قریب آچکے تھے اور اپنی اپنی زبان میں تبصرہ کر رہے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ یہ قطب شمالی کی کوئی بد روح ہے جو ہمارے اگلو کے اندر گھس گئی ہے۔

آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ اگلو نرم برف کا بنا ہوتا ہے۔ جی نہیں یہ جمی برفیلی اینٹوں سے بنا ہوتا ہے وہ لوہے کی طرح سخت ہوتی ہیں۔ لیکن سب کیری بو کی طاقت دیکھ کر حیران تھے۔ اس نے ذرا دیر میں اگلو کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ اگلو کا اندر کا فرش باہر کی زمین کے مقابلے میں کافی گرا تھا اس لئے اپنے بھاری جسم کے ساتھ کیری بو واپس باہر نہیں نکل پا رہا تھا۔ لیکن اس کے سینگ اور اس کے کھُر اگلو کی بچی کھچی دیواروں کو توڑنے میں مصروف تھے۔ سینگوں کی طرح کیری بو کے کھُر بھی حد خوفناک ہوتے ہیں۔ ان کی ایک ٹھوکر سے اچھے بھلے اور طاقتور آدمی کی پسلیاں ٹوٹ سکتی ہیں اور وہ مر سکتا ہے۔ کیری بو کی مچائی ہوئی تباہی کو دیکھنے کے لئے بستی کے دوسرے اسکیمو بھی آگئے تھے لیکن ان میں کوئی قریب نہیں آیا تھا کیونکہ کیری بو سے سبھی خوف زدہ تھے۔

"کوئی ہے جو اس بد روح کو قابو کر سکے؟" آلرک نے وہاں جمع ہونے والے اسکیموؤں سے کہا۔

لمبے بالوں والا زیب فوراً آگے بڑھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس بستی میں اس سے زیادہ بہادر آدمی کوئی نہیں۔ دوسرے اس کی بہادری دیکھنے کے لئے چند قدم آگے بڑھ آئے۔ ذیشان کا خیال تھا کہ زیب بہادر نہیں غبی ہے۔ خیال اس کا ٹھیک ہی تھا۔ کیونکہ اگلو کی ٹوٹی پھوٹی لیکن بلند دیواروں میں محصور کیری بو کو قابو کرنا اسے بے حد آسان لگا۔ اس نے سوچا کہ بستی والوں پر آج بہادری کا سکہ جمانے کا موقع ہے۔ لیکن اسے کیری بو سے مقابلے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس نے کیری بو کے سینگوں کو زیادہ خطرناک تصور کرتے ہوئے اسے دم سے پکڑ لیا اور کھینچنا شروع کیا۔ کیری بو تو کیا کوئی بھی قطبی جانور اپنی دم پکڑوانا پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ کیری بو نے پہلے اپنی دم چھڑانے کی کوشش کی اور پھر ناکام ہو کر اپنے مضبوط کھروں سے الٹی لات زیب کے پیٹ پر رسید کی اور زیب ایک ہی لات میں کئی فٹ دور جا گرا۔

ذیشان نے دوڑ کر اسے اٹھایا۔ وہ اپنا پیٹ پکڑ کر دوہرا ہوا جا رہا تھا۔ "تمہیں اس چوٹ پر مجھے کچھ نہ کچھ ادا کرنا ہوگا۔" اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ ذیشان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اگلو اب مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا۔ کیری بو اگلو سے باہر نکل کر سیدھا ذیشان کی طرف آیا۔ ذیشان نے کوئی راستہ نہ پاکر اپنے دونوں مضبوط ہاتھوں سے اس کے سینگوں کو پکڑ لیا۔ کیری بو نے ناک سے پھنکاریں مارتے ہوئے اسے زمین سے آٹھ فٹ تک اوپر اٹھالیا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ کیری بو بار بار ذیشان کو زمین پر پٹخنے کی کوشش کر رہا تھا اور ذیشان دونوں ہاتھوں سے اس کے سینگوں کو پکڑ کر لٹکا ہوا تھا۔ اب میری باری تھی۔ اگر میرا چھوٹا بھائی اتنی بہادری دکھا سکتا تھا تو میں کیوں پیچھے رہتا۔ میں نے بھی کیری بو کو سینگوں سے پکڑ لیا۔ اب ہم دونوں کے مشترکہ وزن کو کیری بو اٹھانے سے قاصر تھا۔ آلرک بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گیا اور ہم تینوں نے کیری بو کو ہلنے سے روک دیا۔ اس میں ہماری بہادری سے زیادہ کیری بو کی مجبوری کو بھی دخل تھا کیونکہ کیری بو کے پچھلے پیر اگلو کی ٹوٹی پھوٹی اینٹوں میں پھنسے ہوئے تھے۔

کیری بو کو پھنسا ہوا دیکھ کر زیب پر پھر بہادری کا دورہ پڑا۔ وہ ایک ہاتھ میں چابک لے کر کیری بو کی طرف بڑھا اور چلایا۔

"میں اس کو سخت سزا دوں گا۔"

ذیشان نے ایک ہاتھ فارغ کر کے زیب سے چابک چھین لیا اور بولا "تم جنگلی جانوروں کے بارے میں کیا جانتے ہو۔"

"اس نے ساری زندگی مچھلیوں کے سوا کچھ نہیں پکڑا۔" زیب کے بجائے آلرک نے کہا۔ "یہ جنگلی جانوروں کے بارے میں کیا جانے۔"

کیری بو نے ایک مرتبہ پھر اپنا سر پوری طاقت سے ہلایا کہ اپنے سینگوں کو ہم تینوں سے آزاد کرا سکے۔ اس سے صرف یہ فائدہ ہوا کہ زیب ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔

اب آلرک نے اپنا کام شروع کیا۔ وہ اپنی زبان میں پتہ نہیں کیری بو کے کانوں میں کیا پڑھ پڑھ کر پھونک رہا تھا اس نے ایک ہاتھ سے کیری بو کے سینگ قابو کئے ہوتے تھے اور دوسرے ہاتھ سے اس کے سر اور کمر پر دھیمے دھیمے تھپکی دے رہا تھا۔ معلوم نہیں یہ آلرک کے پڑھے ہوئے منتروں کا کمال تھا یا اس کے پیار بھری تھپکیوں کا کہ یہ خوفناک قطبی ہرن اب اپنی جدوجہد ترک کر چکا تھا اور خاموش ہو گیا تھا۔ اب اس نے ناک پھنکارنا بھی بند کر دیا تھا۔ اس کی نظریں آلرک پر جمی ہوئی تھیں۔ اسکیمو قطبی ہرنوں کو سدھانے میں ماہر ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ پاکستان میں گھوڑے، خچر، گدھے اور بیل سدھا کر بار برداری کے کام میں لائے جاتے ہیں۔ لیکن قطبی علاقوں خاص طور پر گرین لینڈ اور الاسکا میں اسکیمو قطبی ہرنوں کو سدھاتے ہیں۔ انہیں بیلوں یا گھوڑوں کی جگہ ہل چلانے کے کام میں لایا جاتا ہے۔ سلیج گاڑی میں جتا ہوا ایک قطبی ہرن یا کیری بو دو آدمی کا وزن لے کر ۱۸ میل فی گھنٹہ

کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے۔

کیری بو کو قابو کرنے کے بعد ہمیں اب اچھی طرح اس کا معائنہ کرنے کا موقع ملا۔ اس کے پیر بے حد چوڑے تھے۔ ان چوڑے پیروں کی وجہ سے کیری بو نرم برف میں نہیں دھنستا۔ قدرت، علاقے کے موسم اور ماحول کی مناسبت سے جانوروں میں تبدیلیاں کر دیتی ہے۔ ریگستان کا خاص جانور اونٹ ہے اور اس کے پیر بھی اسی وجہ سے چوڑے ہوتے ہیں کہ نرم ریت میں نہ دھنسیں۔

"کیری بو کے منہ کا اوپری حصہ بالکل بیلچے جیسا ہے۔" ذیشان نے کہا۔

"تم صحیح کہتے ہو۔" آلرک نے کہا۔ "بیلچے نما اس ہڈی کی مدد سے کیری بو برف ہٹاتا ہے تاکہ لائیکن تلاش کر سکے جو اس کی خوراک ہے۔"

لائیکن ایک قسم کی گھاس ہے۔ قطبی علاقوں میں جہاں کچھ نہیں اگ سکتا وہاں لائیکن اُگتی ہے۔ اسے اُگنے اور بڑھنے کے لئے مٹی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ پتھروں اور چٹانوں پر بھی اگ سکتی ہے۔ اسے ہرن کائی بھی کہا جاتا ہے کیونکہ قطبی ہرنوں کی تمام قسمیں اسے بڑے شوق سے کھاتی ہیں۔ یہ برف کی موٹی تہہ میں دبے ہونے کے باوجود بڑھتی رہتی ہے لیکن اس کی لمبائی چند انچ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ بعض اسکیمو بھی اسے کھاتے ہیں۔

"ڈیڈی نے اپنے خط میں ایک کیری بو بھیجنے

"ہاں! مجھے یاد ہے۔" میں بولا۔

بات دراصل یہ تھی کہ ہمارے ڈیڈی لندن کے چڑیا گھر کو جانور سپلائی کرتے تھے اور انہیں اس سے خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ ہم دونوں بھائی گرین لینڈ خاص اسی وجہ سے آئے تھے کہ یہاں سے جو جانور حاصل کر سکیں اسے لندن بھجوادیں۔ ہم نے اسکیموؤں سے کیری بو خریدنے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی اسکیمو اپنا پالتو کیری بو ہمیں دینے کے لئے کسی قیمت پر تیار نہ ہوا۔ کیری بو کی اسکیموؤں کی زندگی میں بڑی اہمیت ہے۔ وہ کیری بو کی کھال کے کمبل استعمال کرتے ہیں۔ اور کھال ہی سے جوتے بناتے ہیں۔ کیری بو کے خون سے اچھا صابن بنتا ہے۔ حد یہ ہے کہ وہ کیری بو کا پیٹ چاکر کر کے اس کی کھائی ہوئی قطبی گھاس لائیکن بھی نکال لیتے ہیں۔ کیری بو سے ان کو گوشت، پنیر، کپڑے، خیمے، بالٹیاں اور بستر ہر چیز حاصل ہوتی ہے۔ شمالی کناڈا میں کیری بو ہزاروں سال سے اسکیموؤں کی زندگی کا اہم ترین حصہ ہے۔

میں نے اور ذیشان نے اس کیری بو کو لندن کے چڑیا گھر بھجوانے کے لئے ایرپورٹ پہنچایا۔ اس ہوائی اڈے سے ہر رات ایک پرواز لانگ آئی لینڈ جاتی تھی۔ کیری بو کو روانہ کر کے ہم کسی اور ایڈونچر کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔

مجھے اب بھیڑیوں سے ڈر نہیں لگتا

شاہدہ صدف

بہت دن سے میں دیکھا ہے میں نے اپنے بابا کو
کفن باندھے ہوئے پھرتا تھا بھیا اپنے سر سے، اب نہیں پھرتا
اور اب کل شام سے امی بھی گھر واپس نہیں آئیں
وہ جب گھر سے نکلتی تھیں
تو ان کے ساتھ کتنے ڈھیر سارے لوگ ہوتے تھے
بہت سی مائیں، بہنیں، بیٹیاں
بستی کی بستی ہی
وہ جب نعرے لگاتی تھیں
"ہمیں کشمیر کو آزاد کرنا ہے
پرانے قرض کو بے باق کرنا ہے"
تو جیسے دل دہک اٹھتے تھے سینوں میں
تو جیسے سوئی بستی، سوئی وادی جاگ اٹھتی تھی
میرا جی چاہتا تھا میں بھی ان کے ساتھ جاؤں پر
مجھے دادی کی خدمت کے بہانے چھوڑ جاتی تھیں
کبھی کہتیں "میری ننھی ابھی چھوٹی ہو تم
نکلی ہیں ہم لمبی مسافت پر
بہت کانٹے ہیں رستے میں، تم اتنا چل نہ پاؤ گی"
کبھی ہاتھوں میں چہرہ تھام کر میرا مجھے کہتیں، مجھے کہتیں
"تم اک بچی نہیں ہو، آنے والی کل ہو
مستقبل ہو ہم سب کا
تمہیں پیچھے ٹھہرنا ہے، تمہیں پڑھنا ہے، لکھنا سیکھنا ہے
آنے والی داستاں کا ایک روشن باب لکھنا ہے
جسے تعبیر دینے کی قسم کھائی ہے ہم نے وہ سہانا خواب لکھنا ہے"
میں ضد کرتی تو کہتیں، مجھ کو سمجھاتیں
کہ "باہر بھیڑیے ہیں۔ سینکڑوں وحشی درندے ہیں
سنو ننھی اگر آہٹ سنائی دے تو دم سادھے ہوئے
خاموش رہنا، کچھ نہیں کہنا۔
یونہی بستر کے اندر، کھاٹ کے نیچے، چھپی رہنا

کبھی بھولے سے بھی دادی کو تم آواز مت دینا"
مگر کل شام سے امی تو گھر واپس نہیں آئیں
مجھے اب خوف آتا ہے
مجھے ابا کی اور بھیا کی صورت یاد آتی ہے
کوئی تو ہو جو بتلائے کہ ابا بھائی اور اماں
کہاں ہیں سب؟
کوئی تو ہو جو لپٹا کر کہے
"ننھی چلو، باہر چمکتی چاندنی میں دور تک ٹہلیں
دھوئیں سے سانس رکتا ہے
کوئی تو ہو جو سمجھائے
کہ دادی کیوں میرا سر رکھ کے سینے پر سسکتی ہے
تڑپتی اور کہتی ہے
"سبھی کو کھا گئے ہیں بھیڑیے ننھی! کوئی واپس نہ آئے گا"

.....○.....

اب ایسا ہے کہ مجھ کو بھیڑیوں سے ڈر نہیں لگتا
میرے سینے سے اک لاوا اٹھتی ہے
بہت محنت مشقت سے، پرانی چارپائی سے
یہ اک ڈنڈا نکالا ہے
میں اب باہر نکل کر بھیڑیوں کے سر کچل دوں گی
بہت دن رو لیا میں نے
بہت دن چھپ لیا میں نے
بس اب سب کو بتا دوں گی
کہ مجھ کو بھیڑیوں سے ڈر نہیں لگتا
مجھے لڑنا بھی آتا ہے
وہ نعرہ، اپنی پیاری ماں کا نعرہ یاد ہے مجھ کو
"ہمیں کشمیر کو آزاد کرنا ہے
پرانے قرض کو بے باق کرنا ہے"

ایک پُراسرار براعظم

سید عدنان یوسف

اس پراسرار براعظم کا سفرنامہ اگلے شمارے میں ملاحظہ کیجئے جسے ایک پاکستانی سائنس داں سید اصغر جمال نے تحریر کیا ہے جو انٹارکٹیکا جانے والی ٹیم میں شامل تھے۔

آپ نے جغرافیے کی کتابوں میں انٹارکٹیکا کا نام ضرور پڑھا ہو گا لیکن انٹارکٹیکا کی دنیا کے بارے میں کم ہی لوگ کچھ جانتے ہیں۔ اس مضمون میں ہم آپ کو اس خطے کے بارے میں بتائیں گے۔ انٹارکٹیکا ایک بہت بڑا برِاعظم ہے جو دنیا کے بالکل جنوبی سرے پر واقع ہے۔ زیادہ تر انٹارکٹیکا برف سے ڈھکا ہوا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں اس براعظم کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے سائنس دانوں کی ایک ٹیم روانہ ہوئی۔ یہ مہم ایک خاص تنظیم کی جانب سے تھی جسے عرفِ عام میں (IGY یا بین الاقوامی ارضیاتی سال) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ ایک بین الاقوامی معاہدہ تھا جس میں دنیا بھر کے ۶۷ ممالک کے پانچ ہزار سے زیادہ سائنس دان حصہ لے رہے تھے۔ یہ مہم اٹھارہ ماہ میں اختتام پذیر ہوگئی۔

انٹارکٹیکا ایک برف کا صحرا

انٹارکٹیکا بے حد سرد بلکہ یوں کہہ لیجئے دنیا کا سرد ترین مقام ہے۔ قطبِ جنوبی پر درجۂ حرارت منفی ۱۲۵ سینٹی گریڈ سے بھی نیچے چلا جاتا ہے۔ گرجتی ہوائیں اس منجمد برف سے ڈھکے براعظم پر زندگی دشوار کر دیتی ہیں۔ برف کی تہہ دور تک پھیلی نظر آتی ہے۔ بعض جگہوں پر یہ تہہ تین میل (تقریباً ۱۵۰۰۰ فٹ) سے بھی گہری ہے۔ یہاں تحقیقات کے لئے جو جگہیں یا کیمپ منتخب کئے

جاتے ہیں وہ "آئس شیلف" کہلاتے ہیں۔
دراصل یہ جگہیں زمین پر نہیں ہوتیں بلکہ یہاں کی برف اس قدر موٹی ہوتی ہے کہ یہ ایک ٹھوس شکل اختیار کر جاتی ہے مگر اس ٹھوس برف کے نیچے پانی ہوتا ہے۔ پہاڑی چوٹیاں ایک حد فاصل کا کام دیتی ہیں، سمندر اور براعظم کے درمیان میں۔ وہ آئس شیلف جس پر تحقیقاتی اسٹیشن قائم ہیں، اس کے ایک طرف خود ایک برفانی پہاڑی سلسلہ اندر تک گیا ہوا ہے جن کی بعض چوٹیاں اٹھارہ ہزار فٹ بلند ہیں مگر انٹارکٹیکا کا اندرونی علاقہ ایک قطبی پلیٹو کی شکل میں ہے برف اور اولوں کا نہ ختم ہونے والا ہموار صحرا۔

انٹارکٹیکا ہی کیوں؟

کوئی شخص سوچ سکتا ہے کہ آخر کیا فائدہ ہے انٹارکٹیکا میں جا کر برفانی یخ بستہ ہواؤں سے مقابلہ کرنے کا۔ یہ سب چیزیں بآسانی ہمارے شمالی علاقوں میں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ شاید اس لئے برسوں تک لوگ انٹارکٹیکا جانے سے ہچکچاتے تھے۔ پھر سائنس دانوں نے یہ بات دریافت کی کہ انٹارکٹیکا خود اس کرۂ ارض کے کئی پیدا کردہ سوالوں کا جواب ہے۔ بین الاقوامی ارضیاتی سال میں ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے سائنس دان وہاں گئے۔ کچھ نے گلیشئروں پر تحقیق کی، کچھ زلزلوں کو جانچنے لگ گئے اور کچھ نے تیزی سے بدلتے موسم پر اعداد شمار جمع کئے۔ ہر طرح کے مقناطیسی اور کشش ثقل کے اثرات انہوں نے وہاں معلوم کئے۔ سردی اس قدر تھی کہ جسم کا ٹھٹھرا جانے والا کوئی بھی عضو جم کے رہ جاتا۔ انہوں نے وہاں ہر قسم کی زندہ شے پر تحقیق کی کہ وہ وہاں کیسے گزارہ کرتی ہے۔ انہوں نے زمین کی چھت سے سورج کا بھی معائنہ کیا۔

برف اور گلیشئیر

اس سلسلے میں ایک دلچسپ سوال یہ بھی تھا کہ آخر اس براعظم کی برف عام جھیلوں اور تالابوں کی برف سے کیوں مختلف ہے اور اس پر کیوں تحقیق کی جائے جہاں تک برف پر تحقیق کرنے کا سوال ہے تو برف اپنے اندر بہت سی کہانیاں چھپائے رکھتی ہے۔ یہ ایک تصویر پیش کرتی ہے کہ زمین میں ماضی میں کون کون سی تبدیلیاں ہوئیں۔ یہاں تک کہ برف مستقبل میں ہونے والی تبدیلیوں کو بھی قبل از وقت ظاہر کر دیتی ہے۔ عظیم برف کی تہیں گرین لینڈ اور انٹارکٹیکا جیسے بڑے علاقوں کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہیں۔ انہیں براعظمی گلیشئیر کہا جاتا ہے۔ ایسے گلیشئیر پورے پورے براعظموں پر موجود رہتے ہیں۔ البتہ وادیوں میں پائے جانے والے گلیشئر نسبتاً چھوٹے ہوتے ہیں۔ برف جب مسلسل گرتی ہے اور تہہ در تہہ جمتی رہتی ہے تو گلیشئر وجود میں آتے ہیں اور جب یہ جمی ہوئی برف ٹوٹنے یا پگھلنے پر آتی ہے تو اس میں سینکڑوں فٹ گہری دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ یہ دراڑیں کوہ پیماؤں اور سیاحوں کے لئے بے حد خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔ یہ گلیشئر سائنس دانوں کے لئے اس لئے اہم ہیں

کہ ان کے وجود سے زمین میں بہت سی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ گلیشئر ایک جمے ہوئے دریا کی صورت میں چند انچ روز کے رفتار سے کھسکتا ہے۔ بعض گلیشئر ایسے بھی دریافت ہوئے ہیں جن کی رفتار ہزاروں فٹ فی روز تک بڑھ جاتی ہے۔ بہت سی وادیاں اور دراڑیں انہی کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں۔ اس وقت دنیا کے دس فیصد حصے پر برف منجمد ہے۔ یہ برف خود زمین کے موسم کی تبدیلی میں مدد گار ثابت ہوتی ہے۔ آج کل کے حالات اور اوزون میں تہہ در تہہ سوراخ زمین کے درجۂ حرارت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اگر زمین کا درجۂ حرارت بڑھا تو لاکھوں کروڑوں مربع میل پر موجود انٹارکٹیکا کی تین میل موٹی برف کی تہہ سمیت جب پوری دنیا کی برف پگھلے گی تو سطح سمندر اندازاً دو سو فٹ اپنی جگہ سے بلند ہو جائے گا۔ کراچی، بمبئی اور واشنگٹن جیسے شہروں کا تو پتا بھی نہیں چلے گا۔ نیو یارک کا مجسمۂ آزادی ناک تک پانی میں ڈوب جائے گا۔ اور ایمپائر اسٹیٹ اور سینرز ٹاور جیسی عمارتیں دسویں حصہ تک پانی میں ڈوب جائیں گی۔

برفانی تودے:

بہت سے سیاح اس وقت بہت حیران ہوئے جب انہوں نے پہلی بار برفانی تودے دیکھے۔ برفانی تودے بہت بڑے اور عظیم الشان برف کے ٹکڑے ہوتے ہیں جو گلیشیئروں سے ٹوٹ کر الگ ہو جاتے ہیں اور پھر ہوا کے دوش پر سمندروں میں پہنچ جاتے ہیں۔ سمندر میں آوارہ پھرتے ہوئے یہ تودے بحری جہازوں کی موت کا پیغام لاتے ہیں اور شمالی اٹلانٹک اور بحر انٹارکٹیکا میں پائے جانے والے تودے جسامت کے لحاظ سے زیادہ خطرے کا باعث ہوتے ہیں۔ کچھ تودے میلوں پر پھیلے ہزاروں فٹ اونچے اور کئی ملین ٹن وزنی ہوتے ہیں۔ ان کا سطح سمندر سے نیچے والا حصہ اوپر والے حصے سے کم و بیش سات گنا بڑا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تازہ پانی کی برف سے بنتے ہیں جو پانی سے بھاری ہوتی ہے۔ یہ تودے مسلسل ٹوٹتے ہیں اور ہوائیں انہیں گرم علاقوں میں لے جاتی ہیں جہاں یہ پگھل جاتے ہیں۔ انٹارکٹیکا پہنچنے والے سیاح اپنے جہازوں کے آگے ایک مخصوص جہاز رکھتے ہیں جو برف میں راستہ بناتا جاتا ہے، اسے آئس بریکر، بھی کہا جاتا ہے۔ ان تودوں کو ہٹانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ یہ اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ انہیں نہ تو برف شکن جہاز توڑ سکتا ہے اور نہ ہی یہ دھماکے یا بارود سے تباہ کئے جاسکتے ہیں۔ ایک عام جہاز کے لئے یہی حل رہ جاتا ہے کہ وہ گھوم کر وہاں سے نکل جائے ورنہ نہ صرف اسے نقصان پہنچے گا بلکہ وہ ڈوب بھی سکتا ہے۔

ظاہر ہے یہ باتیں انٹارکٹیکا کی تحقیق سے ہی معلوم ہو سکیں۔ انٹارکٹیکا آج بھی سائنس دانوں کی دلچسپی کا باعث بنا ہوا ہے اور پچھلے ہی برسوں ایک ٹیم وہاں سے تفتیش کر کے لوٹی ہے۔

مناسب دام - بہت آرام

آنکھ مچولی

گھر بیٹھے پائیے

86 روپے بچائیے

آنکھ مچولی کے ۱۰ عام اور ۲ خاص شماروں کی سالانہ قیمت مع رجسٹرڈ ڈاک خرچ ۲۶۰ روپے بنتی ہے

مگر

ممبر شپ حاصل کرنے پر ۶۰ روپے کی خصوصی بچت

آپ ہمیں ۲۰۰ روپے کا منی آرڈر روانہ کر دیجئے
ہم آپ کو سال بھر آنکھ مچولی باقاعدگی سے بھجواتے رہیں گے ۔

- منی آرڈر فارم پر اپنا مفصل نام اور پتہ ضرور لکھئے۔
- مشرقِ وسطیٰ کیلئے ۴۰۰ روپے
- امریکہ اور یورپ کیلئے ۵۰۰ روپے

منی آرڈر اس پتے پر روانہ کریں

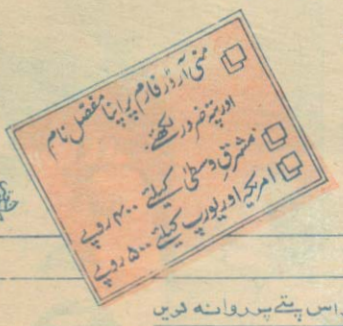

ماہ نامہ آنکھ مچولی - 1 - پی - آئی - بی کالونی، کراچی - 5

ہم نے بچوں کو الیکشن لڑایا

خرم طارق جگنو

ہم نے بھی بچپن میں ایک شرارت کی تھی جو آخری ثابت ہوئی (ویسے ہم اب بھی بچے ہی ہیں کہیں آپ ہمیں بوڑھا نہ سمجھنے لگیں)

ہوا یوں کہ ہمارے محلے میں بے شمار بچے تھے جن میں سے ہر ایک آفت کا پرکالہ تھا۔ ملک میں جب الیکشن کی گہما گہمی شروع ہوئی تو ہم نے سوچا کہ انتخابات ہمیشہ بڑوں ہی کے درمیان ہوتے ہیں بچوں میں کیوں نہیں ہوتے۔ چنانچہ ہم نے اپنے محلے میں بچوں کے انتخابات کرانے کا سوچا اور پھر اس سلسلے میں محلے کے آوارہ اور شریر بچوں سے رجوع کیا۔ انہوں نے ہمیں مشورہ دیا کہ انتخابات تو سب کے لئے ہوتے ہیں اس لئے آپ پہلے تمام بچوں سے ملیں۔ چنانچہ ہم نے محلے کے بچوں کا ایک جلسہ عام منعقد کیا۔ (بچوں کی تعداد کے لحاظ

سے یہ جلسہ سے زیادہ "جلسی" تھی) جلسے میں ہم نے ایک عدد تقریر کی اور تقریر کے دوران جذباتی ہو کر ہم نے پوچھا کہ جو بچے انتخابات کرانے کے حق میں ہیں وہ اپنے ہاتھ اٹھائیں سب بچوں نے جوش میں ہاتھ کھڑے کر دیئے پھر ہم نے انہیں بتایا کہ انتخابات کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہیں۔ اس میں پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ اور یہ خرچ آپ بچوں ہی کو برداشت کرنا ہوگا۔

یہ سن کر چند بچوں کے سوا سب بچے ٹھنڈے پڑ گئے۔ ان میں کچھ بچے پیسے والے تھے انہوں نے ہمت سے کام لیا اور کہا فکر کی کوئی بات نہیں کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے گا۔ مجھ سے بولے "آپ جی الیکشن کرائیں۔ ہم دیکھ لیں گے۔" خیر صاحب۔ ہمارا حوصلہ ان باتوں سے خاصا بلند ہوا۔ ہم نے خود کو چیف الیکشن کمشنر کے عہدے پر فائز سمجھتے ہوئے الیکشن کے ضابطہ اخلاق کا اعلان کر دیا ضابطہ اخلاق یہ تھا:۔

اپنے اپنے گھر کے دروازوں اور دیواروں پر اشتہارات نہیں لگائے جائیں گے اس سے گندگی پھیلتی ہے اور دیواریں بد نما لگتی ہیں البتہ دوسرے گھروں کے سلسلے میں اس ہدایت پر عمل ضروری نہیں۔ الیکشن کے دوران امیداروں سے لے کر کھانے پینے کی چیزیں ضرور کھائیں مگر گندگی نہ پھیلائیں۔

تقریریں وغیرہ گلیوں اور بازاروں میں نہ کریں بلکہ کسی کھلی جگہ مثلاً اپنے گھر کے آنگن وغیرہ میں کریں۔ ضابطہ اخلاق میں ایک شق یہ بھی تھی کہ امیدوار جو وعدے کرے گا جیتنے کے بعد اسے پورے کرنا اس کی ذمہ داری نہیں ہوگی۔ اس کے علاوہ پٹاخے وغیرہ کا استعمال نہیں ہوگا۔

لڑکوں نے ضابطہ اخلاق پر فوراً عمل کیا اور چند ہی دن میں سب نے دوسروں کے گھر پر اشتہارات لگا دیئے۔ میدان میں تین امیدوار اترے یہ امیدوار تھے جناب موٹو بھائی عرف پیٹو، عمران عرف کتابی کیڑا اور سلیمان عرف کھلونا۔

تینوں امیدواروں نے انتخابی مہم کے سلسلے میں پوسٹرز چسپاں کئے جن پر ان کا منشور اور وعدے وغیرہ درج تھے۔

موٹو بھائی پیٹو کے اشتہار میں کہا گیا تھا "میرے پیارے بھائیو اور بہنو جیسا کہ آپ کو پتہ ہے کہ میں یعنی موٹو بھائی الیکشن میں کھڑا ہوا ہوں۔ مجھے جیتنے کے لئے آپ کی دعاؤں سے زیادہ آپ کے ووٹوں کی ضرورت ہے اگر آپ ہمیں اپنا قیمتی ووٹ دے کر کامیاب بنائیں گے تو ہم آپ کا منہ بھر دیں گے۔ کس چیز سے۔ یہ ہم آپ کو الیکشن جیت کر بتائیں گے۔ اور ہاں وہ لڑکے جو کانگڑی پہلوان کہلاتے ہیں وہ تو ضرور مجھے ووٹ دیں میں ان کو اپنی طرح موٹا تازہ کر دوں گا شکریہ۔"

عمران عرف کتابی کیڑے نے اپنے اشتہار میں لکھا تھا کہ اگر آپ مجھے ووٹ دیں گے تو میں آپ کو ٹارزن اور سپرمین، وغیرہ کی کتابیں مفت پڑھنے دوں گا جن کو پڑھ کر آپ بھی سپرمین وغیرہ

کہلوائیں گے آپ کے ووٹ کا میں اصل حقدار ہوں آپ کا پیارا راج دلارا دوست عمران عرف کتابی کیڑا۔

سلیمان عرف کھلونا نے اشتہار میں کہا تھا کہ میں آپ کی فرمائش پر تمام ایسے کھلونے لے کر دوں گا جو آپ کے ابو آپ کو لا کر نہیں دے سکے آپ صرف ہمیں یعنی سلیمان کو ووٹ دیں بس پھر آپ کے دن پھر جائیں گے۔ پوسٹروں کے علاوہ جلسے بھی ہوئے جن میں تمام امیدواروں نے بہت خوش آمدانہ تقریریں کیں۔ ووٹروں کو ہر طرح کی لالچ دی خدا خدا کر کے الیکشن کا دن آیا بچوں نے پورے جوش و خروش سے ووٹ ڈالے۔ آخر میں جب ووٹ گننے کے لئے ڈبے کھلے تو یہ دیکھ کر سب حیران ہو گئے کہ کسی بچے نے بھی صحیح ووٹ نہیں ڈالا تھا۔ بیلٹ پیپر پر دو دو ناموں کے سامنے مہر لگائی گئی تھی۔ سارے ووٹ ضائع ہو گئے۔ جتنا روپیہ الیکشن میں لگایا گیا تھا سب برباد گیا میں کیا بتاؤں کہ پھر کیا ہوا۔ ووٹر حضرات مجھے تینوں امیدواروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلتے بنے اور پھر اس کے بعد امیدوار حضرات میری طرف بڑھے اس سے پہلے کہ میں انہیں روکتا انہوں نے میری یعنی چیف الیکشن کمشنر کی ایسی درگت بنائی کہ جب میں نے بھاگ کر گھر میں پناہ لینے کے لئے دروازہ کھٹکھٹایا تو تو گھر والوں نے کہا معاف کرو جی جمعرات کے دن آنا انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ توان کا ہی چشم و چراغ ہے جو زمانے کے ہاتھوں ستایا گیا ہے۔

اقوال زریں

۱۔ تجربہ ایسی کنگھی ہے جو زندگی میں ہمیں ایسے وقت کام دیتی ہے جب ہمارے بال جھڑ جاتے ہیں۔

۲۔ الفاظ کے پیچھے مت بھاگو۔ بلکہ خیالات تلاش کرو۔ جب خیالات کا ہجوم ہو گا تو الفاظ خود بخود مل جائیں گے۔

۳۔ نصیحت ایسی چیز ہے جس کی عقل مندوں کو ضرورت نہیں اور بے وقوف اسے قبول نہیں کرتے۔

۴۔ جہاں صداقت اور خلوص نظر آئے وہاں دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ ورنہ تنہائی ہی تمہاری بہترین رفیق ہے۔

۵۔ کپڑے کو کاٹنے سے پہلے سات بار ناپو کیونکہ اسے کاٹنے کا ایک ہی موقع ہوتا ہے۔

۶۔ بغیر دیکھے کوئی چیز منہ میں نہ ڈالو اور بغیر پڑھے کسی چیز پر دستخط نہ کرو۔

۷۔ بچھو کی دم میں زہر ہوتا ہے۔ سانپ کے دانت میں۔ مچھر کے سر میں۔ لیکن بڑے آدمی کے پورے وجود میں زہر ہوتا ہے۔

مرسلہ..... محمد عظمت حنیف، راولپنڈی

اس واقعے پر گھر والوں نے تو جو مذاق اڑایا سو اڑایا مگر محلے میں بھی ہم سر اٹھانے کے قابل نہ رہے۔ پھر کبھی ہم نے ایسی شرارت کرنے کی نہ سوچی۔

سوال پوچھئے

سائنسی معلومات کا کالم

ایاز محمود

سوال: سنا ہے کہ چمگادڑ کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔ تو پھر وہ اڑتے ہوئے سامنے کوئی چیز آ جانے پر راستہ کیسے بدل لیتی ہے؟

پرنس افضل شاہین، بہاولنگر۔

جواب: آپ نے کسی سے غلط سنا ہے۔ چمگادڑوں کی آنکھیں بھی ہوتی ہیں اور وہ دیکھ بھی سکتی ہیں۔ لیکن چونکہ یہ تاریکی میں رہتی ہیں اس لئے ان کے بارے میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ انہیں نظر نہیں آتا۔ یہ ایک مفروضہ ہے حقیقت نہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے چمگادڑوں کو راستہ بدلنے کے لئے آنکھوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر بھی چھوڑ دیا جائے تو یہ اِدھر اُدھر ٹکراتی نہیں پھریں گے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے باقاعدہ تجربے ہوئے ہیں۔ سائنس دانوں نے عملِ جراحی کے ذریعے ایک چمگادڑ کی آنکھیں نکال دیں لیکن چمگادڑ کو اپنا راستہ تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

بات دراصل یہ ہے کہ چمگادڑ اڑتے ہوئے اپنے منہ سے ایک خاص قسم کی آواز نکالتی ہے۔ یہ آواز اتنی زیادہ فریکونسی کی ہوتی ہے کہ ہمارے کان اس کو محسوس نہیں کرتے۔ یہ آواز رستے میں موجود کسی بھی رکاوٹ سے ٹکرا کر واپس آتی ہے اور اسے سن کر چمگادڑ کو پتا چل جاتا ہے کہ سامنے کوئی چیز موجود ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ سامنے والی رکاوٹ کے درست فاصلے کا بھی تعین ہو جاتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اس نظام کی بدولت چمگادڑ کو راستے میں اڑتے ہوئے کیڑے مکوڑوں اور پتنگوں وغیرہ کا بھی پتا چل جاتا ہے جو اس کی خوراک ہیں۔

ہم آپ کو سونار نامی آلے کے متعلق تفصیل سے بتا چکے ہیں یہ آلہ سمندری جہاز کو سمندر کی گہرائی یا پانی میں چھپی ہوئی آبدوز کا پتہ دیتا ہے

یہاں بھی وہی اصول کار فرما ہے۔ اس آلے سے سمندر کی تہہ میں آواز کی موجیں پھینکی جاتی ہیں جو سمندر کی تہہ یا آبدوز وغیرہ سے ٹکرا کر آتی ہیں اور اس درست فاصلہ کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔

چمگادڑ کو عام طور پر پرندہ سمجھا جاتا ہے یہ تصور غلط ہے یہ ایک دودھ پلانے والا جانور ہے۔

سوال: کنگ کانگ اور ڈائنا سار کی نسل کس طرح ناپید ہوئی؟

غضنفر رشید، چکوال۔

جواب: کنگ کانگ تو ایک خیالی جانور ہے جسے سینما کے پردے پر دکھایا گیا ہے۔ یہ ایک بہت ہی بڑی جسامت کا گوریلا ہے جس کے قد کے سامنے بڑی سے بڑی عمارت بھی کچھ نہیں۔ لیکن بھائی یہ سب قصے کہانیوں کی باتیں ہیں جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

اب ذکر ڈائنو سار کی نسل کا ہو جائے۔ آپ نے ڈائنا سار لکھا ہے۔ صحیح تلفظ ڈائنو سار ہی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ جانوروں کے اس عظیم الشان گروہ کا ساری دنیا میں راج تھا۔ یہ بہت خوف ناک جانور تھے اور ان کی جسامت آج کل کے ہاتھی کے مقابلے میں بھی کئی گنا ہوتی تھی۔

آج سے کروڑوں سال پہلے دنیا کی آب و ہوا مرطوب تھی اور زمین زیادہ تر دلدلی علاقوں پر مشتمل تھی۔ ڈائنو سار اسی ماحول میں رہتے اور پھلتے پھولتے تھے۔ آج سے کوئی دس کروڑ سال پہلے دنیا کا موسم تبدیل ہونا شروع ہوا اور ایک سرد

عجیب پیاز

امریکہ میں سائنس دانوں نے پیاز کی ایسی قسم اگائی ہے جس کو کاٹتے وقت آنکھوں سے آنسو نہیں بہتے۔

مرسلہ..... محمد عمر سومرو، خیر پور سادات

دور کا آغاز ہو گیا۔ ڈائنو سار اپنی تمام تر جسامت کے ساتھ اس تبدیلی کا مقابلہ نہ کر سکے اور آہستہ آہستہ ان کی نسلیں ناپید ہونے لگیں۔ آج سے تقریباً چھ کروڑ سال پہلے یہ بالکل ہی معدوم ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ زمین پر جانوروں اور نباتات کی وہی اقسام باقی رہ جاتی ہیں جو موسمی، جغرافیائی اور دیگر طبعی حالات میں تبدیلی کے لحاظ سے خود کو ڈھالنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔

سوال: سردیوں میں صبح کے وقت ہمارے منہ سے دھواں کیوں نکلتا ہے؟

محمد عمر قریشی، اسلام آباد۔

جواب: سردیوں میں بیرونی درجۂ حرارت خاصا گر جاتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے جسم کا درجۂ حرارت معمول کے مطابق ہی رہتا ہے۔ سانس باہر نکالتے وقت گرم ہوا باہر جاتی ہے۔ اس ہوا میں آبی بخارات بھی شامل ہوتے ہیں جو باہر ماحول کی ٹھنڈک کی وجہ سے باریک باریک قطروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور ہمیں بھاپ کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ آپ نے سوال میں لفظ دھواں لکھا ہے یہ درست نہیں۔ اس کی جگہ بھاپ کہنا چاہیے۔

عبدالوارث کے کارٹون

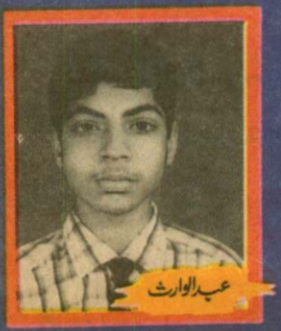

آپ کو تتلی کا انتظار تھا!

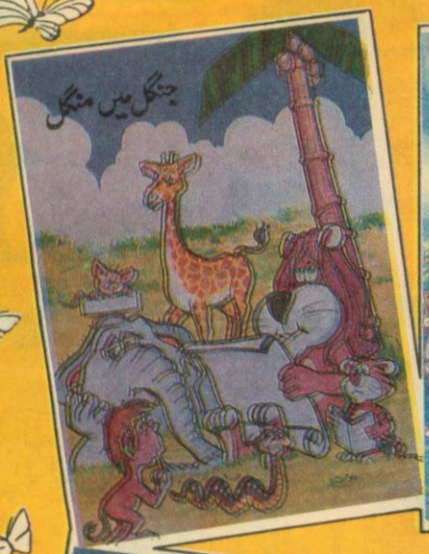

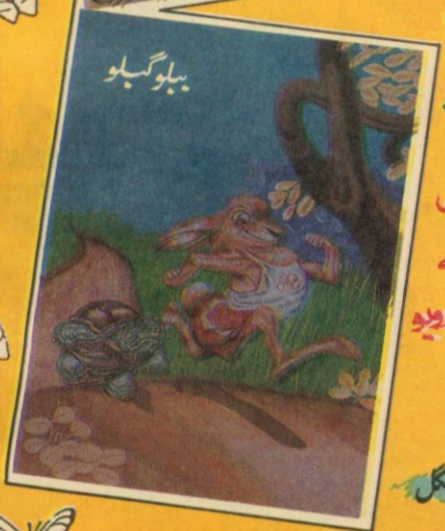

ننھے بچو! تتلی کے حسین رنگوں کو
سمیٹ کر "تتلی" شائع ہو گیا۔ اس
خوبصورت کتابی سلسلے میں آپ کیلئے

- مزیدار کہانیاں
- دلکش نظمیں
- بھول بھلیاں
- چٹ پٹے لطیفے
- چلبلے کارٹون
- معلوماتی انٹرویو
- رنگا رنگ تصویریں

تتلی کے تین خوب صورت شمارے

پیارا پاکستان ببلو گبلو جنگل میں منگل

پاکستان کے تمام بڑے بک اسٹالوں پر دستیاب ہے

منگوانے کا پتہ: ۱-پی آئی بی کالونی کراچی ۷۴۸۰۰ قیمت ۱۰ روپے

ہنستے ہنستے

ایک قوال اپنی پارٹی کے ساتھ ریل گاڑی میں سفر کر رہا تھا گارڈ نے ٹکٹ مانگا تو قوال نے کہا۔

جو کچھ مانگنا ہے در مصطفیٰ سے مانگ

گارڈ نے غصے سے کہا "تمہارے ساتھ اور کون ہے؟"

قوال نے کہا۔

میرا کوئی نہیں ہے تیرے سوا

مرسلہ...... عبد الباسط عمران ظفر، ڈسکہ

بھارتی جنرل (اپنے سپاہیوں سے) "شاباش نوجوانو! محاذ پر ڈٹے رہو اور اس وقت تک کہ جب تک تمہارے پاس ایک گولی بھی باقی رہے پیچھے ہٹنے کا تصور بھی نہ کرنا ہاں جب تم آخری گولی چلا چکو تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا میں ابھی سے بھاگ رہا ہوں کیونکہ میری ٹانگ میں تھوڑا سا لنگ ہے۔"

مرسلہ...... جنید اختر، کراچی۔

نوکر۔ "صاحب جی! سریف پور سے سریف صاحب نے سریفے بھیجے ہیں۔"

مالک۔ "ارے بھائی کبھی ش بھی بول لیا کرو۔"

نوکر۔ "وہ جی شاب نے شلام بھی بھیجا ہے۔"

مرسلہ...... سبھاش چندر، لاڑکانہ

ادریس:۔ (حنیف سے) "اس پہاڑ پر کچھ بھی نہیں ہے جو لوگ چڑھ رہے ہیں وہ سب بے وقوف ہیں۔"

حنیف:۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

ادریس:۔ "میں نے اس پر چڑھ کر دیکھا ہے۔"

مرسلہ:۔ ثروت یعقوب، لاہور

جج (ملزم سے) "تم نے سیٹھ آلو خاں کو کیوں مارا؟"

ملزم۔ "جناب! وہ میرے کھیت سے بہت سے آلو چرا رہا تھا۔"

مرسلہ...... لیاقت حسین علوی، ملتان۔

ایک آدمی ایک بچے سے۔ "بھئی منے! ڈاک خانہ کہاں ہے؟"

بچہ: "جی! وہ ہمارے گھر کے سامنے ہیں۔"

آدمی۔ "تمہارا گھر کہاں ہے؟"

بچہ: "جی ڈاک خانے کے سامنے۔"

آدمی (تنگ آکر) "اف! یہ دونوں کہاں ہیں؟"

بچہ: "جی آمنے سامنے۔"

مرسلہ ..... سید محمد طلحہ، راولپنڈی

ایک چور کی جیل سے رہائی ملنے والی تھی اور وہ اگلے روز رہا ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھی قیدی نے اس سے پوچھا "یار! تم جیل سے رہا ہو کر سب سے پہلا کام کیا کرو گے؟"

چور نے جواب دیا۔ "میں ایک ٹارچ خریدوں گا کیونکہ پچھلی دفعہ میں نے اندھیرے میں بجلی کے بجائے ریڈیو کا بٹن دبا دیا تھا۔"

مرسلہ ..... عامر ضیا، کراچی

ایک شخص نے جیب کترے کو عین اس وقت پکڑا جب وہ جیب کاٹ کر فرار ہو رہا تھا۔ اس شخص نے غصے سے کہا "تمہیں شرم نہیں آتی میری جیب کاٹتے ہوئے؟"

جیب کترا ڈھٹائی سے بولا۔ "شرم تو آپ کو آنی چاہئے اتنا قیمتی لباس پہنا ہوا ہے اور جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں۔"

مرسلہ ..... محمد ارشد، منڈی بہاؤالدین

مسافر (رہ گیر سے) "جناب یہ سڑک کہاں جاتی ہے؟"

راہ گیر "یہ کہیں نہیں جاتی سارا دن اسی جگہ پڑی رہتی ہے۔"

مرسلہ نشاط رینہ، ملتان

(ایک شخص دوسرے سے) "تم کون ہو؟"

دوسرا شخص "میں وہ ہوں جس سے سب معافی مانگتے ہیں"

پہلا شخص وہ کیسے؟"

دوسرا:۔ "میں فقیر ہوں۔"

مرسلہ ..... عبدالباسط، ہری پور

(ایک شخص دوسرے سے) "ایک دفعہ میرے ساتھ بہت خوفناک واقعہ پیش آیا۔ شیر ہمارے بالکل سامنے آگیا اور ہمیں دیکھ کر غرانے لگا۔"

دوسرا شخص:۔ "پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا ہم ایک دم چڑیا گھر کے جنگلے سے پیچھے ہٹ گئے۔"

مرسلہ ..... عبدالباسط ہری پوری

امریکا کا ایک قصبہ طوفان کی لپیٹ میں آگیا وہاں سیلاب بھی آگیا۔ ایک ننھی بچی اپنے گھر کی چھت پر کھڑی تھی اور حیرت سے اس ٹوپی کو دیکھ رہی تھی جو بار بار اس کے گھر کے قریب آتی اور پھر دور چلی جاتی۔ اتنے میں ایک لڑکا اسے نظر آیا تو بچی نے اس سے پوچھا:

"یہ کیا چکر ہے؟"

لڑکے نے جواب دیا، "یہ میرے ابو ہیں انہوں نے کچھ دیر پہلے کہا تھا آج چاہے طوفان آئے یا سیلاب، میں لان کی گھاس ضرور کاٹوں گا۔"

مرسلہ..... مشتاق احمد، کراچی

الیکشن کے موقع پر ایک لیڈر نے ایک شہر کے بڑے چوک میں تقریر کرتے ہوئے کہا "مجھے بڑی خوشی ہے کہ میں آپ کے شہر حیدر آباد کے دورے پر آیا ہوں۔"

حاضرین نے چلا کر کہا "یہ شہر حیدر آباد نہیں، فیصل آباد ہے۔"

لیڈر نے کہا "میں جانتا ہوں کہ یہ فیصل آباد ہے مگر میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ آپ لوگ سو تو نہیں رہے ہیں۔"

مرسلہ..... عشرت بانو، ریاض احمد، کراچی۔

دو کاروباری حضرات گفتگو کر رہے تھے۔ ایک نے کہا "تمہیں معلوم ہے اشتہار دینے کا نتیجہ کتنی جلدی ظاہر ہو جاتا ہے۔"

"معلوم ہے۔" دوسرے نے کہا۔

"پرسوں میں نے اخبار میں چوکیدار کی ضرورت کا اشتہار دیا اور کل ہی ہمارے گھر میں چوری ہو گئی۔"

مرسلہ..... سرمد اشرف، حیدر آباد

ایک صاحب جو کہ بہت کنجوس تھے دانت کے

درد کی وجہ سے دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس گئے معائنے کے بعد ڈاکٹر نے کہا "یہ دانت نکالنا ہی پڑے گا۔"

"کیا فیس ہوگی؟" ان صاحب نے دریافت کیا۔

"صرف دو سو روپے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"یہ لیجئے پچاس روپے بس تھوڑا سا ڈھیلا کر دیجئے۔"

ان صاحب نے کہا۔

مرسلہ..... ماجد سومرو، شکار پور

ریلوے اسٹیشن پر دو آدمی جھگڑ رہے تھے۔ ایک نے کہا "میں ایسی زور کا ہاتھ ماروں گا کہ تو کراچی پہنچ جائے گا۔" دوسرے نے کہا۔ میں اتنا تیز تھپڑ لگاؤں گا کہ تو لاہور پہنچ جائے گا۔"

ساتھ کھڑا ایک دیہاتی کہنے لگا۔ "استاد جی! ذرامینوں آہستے جے مارنامیں نال آلے سٹیشن جاناں اے!"

مرسلہ ...... پرنس عمر ریاض ساگری، ضلع جہلم

انسپکٹر (لڑکے سے) "تم بغیر اجازت اندر کیوں آئے ہو__؟"

لڑکا "جناب! اجازت لینے اندر آیا ہوں۔"

مرسلہ ...... سیدہ حنانورین کاظمی، کراچی

"ایک حجام جو بہت ہی تیز دھار والے استرے سے گاہک کا شیو کر رہا تھا۔ گاہک سے پوچھنے لگا۔

"آپ کتنے بھائی ہیں؟"

گاہک نے معصومیت سے جواب دیا۔ "تمہارے استرے سے بچ گیا تو چار ہوں گے۔ ورنہ تین ہی سمجھو۔"

مرسلہ:۔ سیدہ حنانورین کاظمی، کراچی

کلرک: "جناب! یہ خط میں بالکل نہیں پڑھ سکتا لکھنے والے کا خط بہت خراب ہے۔"

افسر: "کیابات کرتے ہوں بدھو سے بدھو آدمی اسے پڑھ لے گا۔ لاؤ ادھر دو میں پڑھ کر سناتا ہوں۔"

مرسلہ ...... ماجد حسین جعفری، اوچ شریف

پارلیمنٹ کی رکنیت کا ایک امیدوار جلسہ عام میں تقریر کر رہا تھا کہ مخالف پارٹی کا ایک آدمی کھڑا ہوا اور بولا "اگر تم عزرائیل بھی ہوتے تو میں تمہاری تقریر سننے کے لئے تیار نہ ہوتا۔"

امیدوار نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا "اگر میں عزرائیل ہوتا تو تمہیں جلسے میں آنے کی مہلت ہی نہ دیتا۔"

مرسلہ ...... میر عدیل پرویز، آزاد کشمیر

پیچرنگی بانسری نواز

نعیم مشتاق نومی

شاید یہ کہانی آپ نے پڑھی ہو لیکن یہ وہ کہانی نہیں ہے

ایک دفعہ ایک چھوٹے جرمن قصبے "ہیملن" پر چوہوں نے ہلہ بول دیا...... وہ چوہے، اتنے ظالم، اتنے غضب ناک اور اتنے زیادہ تھے کہ بلی اور کتے بھی گاؤں چھوڑ گئے۔ لوگوں نے ہر قسم کے چوہے دان استعمال کئے مگر بے سود ...... یہ طوفان بلاخیز رکنے والا نہ تھا...... ہر گزرتا لمحہ ان کی تعداد بڑھاتا جارہا تھا اب یہ مخلوق گاؤں کے چپّے چپّے میں پھیل چکی تھی۔ گلیوں میں چوہے...... گھروں میں چوہے، چھتوں پر چوہے...... بالا خانوں پر چوہے...... باورچی خانوں میں چوہے...... میزوں میں چوہے...... حتیٰ کہ خواب گاہوں میں بھی چوہے ...... گاؤں کا کوئی ایسا کونہ، ایسا گوشہ، ایسا حصہ نہ

تھا، جہاں چوہے نہ تھے...... گاؤں کے ہر آدمی کے لبوں پر ایک ہی پکار تھی ...... اف یہ چوہے! ...... ہائے یہ چوہے! ......

وہ گاؤں بہت بڑا تھا...... گاؤں کیا تھا؟ تقریباً شہر ہی تھا...... گاؤں کے تمام معزز لوگ اکٹھے ہو کر میئر کے پاس گئے۔ اور اس بلائے ناگہانی کے بارے میں بتایا۔ ایک نے کہا۔ ''آپ کس قسم کے میئر ہیں؟ ...... آپ کو معلوم ہی نہیں عوام کس عذاب سے گزر رہے ہیں......؟''

''آپ کے ہوتے ہوئے ایسا نہیں ہونا چاہئے ...... آخر آپ لوگ کب ہمارا احساس کریں گے؟ دوسرے نے کہا۔

تیسرا بولا۔ ''آپ کو چاہئے فوراً ایکشن لیں ...... چوہوں نے ہمارے ناک میں دم کر رکھا ہے''۔

چوتھے نے جلے کٹے انداز میں کہا۔ ''انہیں کیا ایکشن لینا ہے!'' وہ جیسے بڑبڑا رہا تھا اُن کا تو بس ایک ہی کام ہے ...... عالیشان دفتر میں بیٹھنا ...... ٹانگ پر ٹانگ رکھنا...... کھڑکی سے باہر گھورتے رہنا ...... اور کچھ نہ کرنا! ......''

''میئر نے انہیں مطمئن کر کے گھر بھیج دیا۔ مگر کیا وہی کچھ، جو اس کا معمول تھا۔ اگلے روز میئر نے کونسلروں کے نام سمن جاری کئے کہ گاؤں والوں کی مدد کریں مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ ہوا تو صرف یہ کہ سرکاری کارروائی ہوئی۔ اور کاغذی خانہ پُری ...... بس!

اِدھر چوہے تھے کہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ ...... ایک جمع ایک ...... دو جمع دو ...... چار جمع چار ...... ان کی گنتی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ گرمیوں کی ایک صبح ...... ریکارڈ کے مطابق یہ سن ۱۳۷۶ء کی بات ہے...... ہیملن میں ایک لمبا تڑنگا عجیب و غریب شکل و صورت کا اجنبی داخل ہوا ...... وہ سیدھا ایوانِ بلدیہ میں گیا۔

وہ بلا جھجک میئر کے دفتر جا گھسا۔ اور براہِ راست اس سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میں نے سنا ہے، آپ لوگ چوہوں سے پریشان ہیں!''

''ہاں! ...... تم نے درست سنا ہے!'' میئر نے جواب دیا۔ ''مگر تم ہو کون ......؟''

اجنبی نے میئر کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کو اس پریشانی سے نجات دلا سکتا ہوں!''

''وہ کیسے!؟'' میئر نے چونک کر پوچھا۔

''میں ایک چوہا کیچر ہوں ......!'' وہ فخریہ انداز میں بولا۔

''چوہا کیچر ......!!!'' میئر حیرت سے بولا ''کیا مطلب......؟''

''میں چوہے پکڑنے والا ہوں۔ میرے پاس ایک خاص طاقت ہے!'' اس نے پُراسرار انداز میں کہا۔ ''آپ اسے جادو بھی کہہ سکتے ہیں ...... اور میوزک بھی ......'' وہ ذرا سا مسکرایا۔ پھر فخریہ لہجے میں بولا۔ ''اس کی مدد سے میں آپ کو اس مصیبت اور عذاب سے نکال سکتا ہوں......''

''مگر تم ہو کون ...... کہاں سے آئے ہو......

اور کرتے کیا ہو؟" ..... میئر نے اس کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے تابڑ توڑ سوال کیے۔ اس کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "ایک ساتھ تین سوال !!! ..... کوئی بات نہیں.....!" اس نے ذرا سا کندھے جھٹکے۔ "لوگ مجھے پچرنگی بانسری نواز کہتے ہیں..... آیا کہاں سے ہوں؟..... یہ بتانا ذرا مشکل ہے ..... بس یوں سمجھ لیں!..... میں ہر جگہ سے آتا ہوں..... کرتا کیا ہوں؟" ..... وہ ذرا سا رکا پھر بولا۔ "جناب میں اسی طرح لوگوں کو مشکل سے نکالتا ہوں۔ کبھی کسی شہر کو چوہوں کے عذاب سے تو کبھی کسی شہر کو چھپکلیوں کے عذاب سے ..... کبھی کسی شہر کو چمگادڑوں کے عذاب سے ..... اور کبھی لال بیگ کے عذاب سے ..... یہی میرا کام ہے، اور یہی میری زندگی..... یہی میری نوکری ہے، اور یہی میری عادت!..... آپ چاہیں تو میں یہ کام آپ کے لئے بھی کر سکتا ہوں!" وہ چند ثانیئے خاموش رہنے کے بعد ہلکا سا کھانسا۔ "آپ کو مجھے صرف ایک ہزار گلڈرز دینا ہوں گے اس کام کے ..... صرف ایک ہزار گلڈرز!....."

میئر نے پہلی بار اس کا تفصیلی جائزہ لیا..... طوطا ناک ..... اندر کو دھنسی ہوئی عقابی آنکھیں ..... مونچھوں کی جگہ فقط چند بال ..... داڑھی صرف ٹھوڑی پر تھی..... گال بالوں سے فارغ ..... سر پر عجیب طرز کا بمبو ٹائپ سرخ ہیٹ ..... گلے میں سکارف ..... جو مختلف رنگوں سے مل کر بنا تھا..... بدن پر ایک لمبا سا چوغہ..... عجیب طرح سے سلا ہوا ..... پاؤں ایسے، جیسے صرف ہڈیاں ہوں ..... جوتے ایسے، جیسے سوکھے پتے ..... ہاتھ کیا تھے؟..... بس مڑی تڑی ٹیڑھی میڑھی ہڈیوں کا مجموعہ تھے ..... ایک ہاتھ میں عجیب سی، لمبوتری بانسری تھی..... جس پر اس کی انگلیاں مسلسل حرکت کر رہی تھیں ..... جو شاید اس کی عادت تھی۔ وہ حقیقتاً ایک عجیب و غریب مخلوق تھا۔

اس مخلوق نے ایک بار پھر کہا۔ "آپ اگر مجھے ایک ہزار گلڈرز دیں:..... تو میں آپ کو آج ہی اس مصیبت سے چھٹکارا دلا دوں گا!"

"ایک ہزار گلڈرز.....!!!" میئر نے کہا۔ "ارے! اگر تم ہماری یہ پرابلم دور کر دو تو ایک کیا؟ ہم تمہیں پچاس ہزار گلڈرز دینے کو تیار ہیں!"

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو.....؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں ہاں!" میئر بولا۔ "اگر تم ہمارا یہ مسئلہ حل کر دو تو ہم تمہیں پچاس ہزار گلڈرز دیں گے ..... آئی پرامس!....."

"ٹھیک ہے.....!" وہ بولا اور دفتر سے باہر نکل گیا۔

وہ سیدھا ہیملن کی گلیوں میں پہنچا اور اپنی بانسری پر ایک عجیب سی دُھن الاپنے لگا۔ وہ دُھن سن کر یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے بہت سی باریک آوازیں مل کر شور مچا رہی ہوں۔

کچھ دیر بعد لوگوں نے عجیب منظر دیکھا..... چوہے تیزی سے گھروں سے باہر آنے لگے..... انہیں دیکھ کر یوں لگ رہا تھا۔ جیسے فوج کے سپاہی جنگی نقارہ سن کر میدانِ جنگ میں پہنچ رہے ہوں ..... ہر طرف سنسناہٹ تھی..... بڑبڑاہٹ تھی..... بھنبھناہٹ تھی..... بڑابڑہٹ آہستہ آہستہ گونج میں تبدیل ہونے لگی..... گونج، گڑگڑاہٹ میں ..... پوری فضا بھنبھناہٹ اور شور کی آوازوں سے تھرا رہی تھی..... کافی دیر گزر گئی..... مگر! ..... ابھی تک چوہے اِدھر اُدھر سے اُمڈتے چلتے آرہے تھے..... بڑے چوہے..... چھوٹے چوہے ..... درمیانے چوہے..... بہت بڑے چوہے..... لمبے چوہے..... بونے چوہے..... موٹے چوہے ..... پتلے چوہے..... بوڑھے چوہے..... جوان چوہے..... گستاخ چوہے..... خوفناک چوہے..... خوبصورت چوہے..... وہاں ہر قسم، ہر رنگ و نسل اور ہر سائز کے چوہے موجود تھے..... جو موجود تھے، وہ عجیب انداز میں خرخرا رہے تھے..... اور جو آرہے تھے ابھی، وہ بھی خرخرا رہے تھے..... پوری فضا میں عجیب سی بدبو اور عجیب سی تھرتھراہٹ تھی.....

وہ عجیب و غریب شکل و صورت والا اجنبی شخص، جس نے اپنا نام پچرنگی بانسری نواز بتایا تھا، ابھی تک اپنی بانسری پر وہی عجیب دھن بجا رہا تھا۔ جب ہر طرف چوہے ہی چوہے ہو گئے، اور ارد گرد کہیں بھی تِل دھرنے کی گنجائش نہ رہی تو وہ شخص اسی طرح وہی دھن بجاتا ہوا ایک طرف چل پڑا..... چوہے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے.....

وہ آگے آگے چلتا رہا..... چوہے اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے..... وہ اپنی بانسری بجاتا رہا..... چوہے مست انداز میں خرخراتے رہے..... وہ چلتا رہا..... چوہے بھی چلتے رہے..... چلتے چلتے وہ دریائے ویزر کے کنارے پہنچ گئے..... وہ اپنی بانسری پر وہی مخصوص دھن بجاتا ہوا دریا میں داخل ہو گیا..... چوہے بھی اس کے پیچھے پیچھے ہی دریا میں پہنچ گئے..... اور پھر بانسری پر دھن بجتی رہی ..... بجتی رہی..... بجتی رہی..... چوہے دریا میں مرتے رہے..... ڈوبتے رہے..... بہتے رہے..... اور پھر آخری چوہا بھی غائب ہو گیا.....

پچرنگی بانسری نواز نے بانسری بجانا بند کر دی۔ اور واپس ہیملن کی طرف مڑا۔ جلد ہی وہ میئر کے دفتر جا پہنچا۔

"میں نے اپنا کام کر دیا ہے.....!" اس نے شائستگی سے میئر کو کہا۔ "اب آپ اپنا کام کیجئے..... اور میرے گلڈرز میرے حوالے کر دیجئے.....!"

"کون سے گلڈرز.....؟"

اس نے تحمل سے کہا۔ "ایک ہزار گلڈرز.....!"

"تم شاید مجھ سے مذاق کر رہے ہو!" میئر ہنسا۔ "بھلا بتاؤ!..... چند چوہوں کو یہاں سے نکالنے کے اتنے زیادہ گلڈرز.....؟..... کیا تم مجھے بے وقوف یا احمق سمجھتے ہو؟..... ارے میاں! اگر تم بہت زیادہ

ضرورت مند ہو تو میں تمہیں پچاس گلڈرز دے دیتا ہوں..... تم بھی کیا یاد کرو گے کس سخی سے پالا پڑا ہے؟....." اس نے پچاس گلڈرز اس کے سامنے میز پر رکھ دیئے۔ "یہ لو!..... اور اپنا رستہ ناپو.....!"

"پچاس نہیں..... ایک ہزار گلڈرز.....!" اس کا لہجہ ابھی تک مہذبانہ اور شائستہ تھا۔ "یہی ہمارے درمیان طے پایا تھا.....!"

"آخر میں تمہیں کس کام کے ہزار گلڈرز دوں؟" میئر کی بھویں پیشانی سے جا لگیں۔

"چوہوں کو شہر سے نکال باہر کرنے کے۔" وہ ابھی تک صبر و تحمل سے کام لے رہا تھا۔

"یہ تو میں مان لیتا ہوں..... تم نے چوہوں کو یہاں سے نکالا..... اور اس کے میں تمہیں پچاس گلڈرز بھی دے رہا ہوں!" میئر نے کہا۔ "مگر..... مگر تم نے تو انہیں ختم نہیں کیا..... تم نے تو نہیں مارا.....!"

"پھر کس نے ختم کیا؟..... کس نے مارا انہیں؟....."

"بڑے میاں!....." میئر نے جیسے سمجھایا۔ "وہ خود دریا میں ڈوب کر مرے ہیں..... تمہارا اس میں کوئی کمال نہیں..... اگر یہ پچاس گلڈرز تمہیں چاہئیں تو انہیں اٹھاؤ..... اور چلتے بنو!" اس نے میز پر پڑے گلڈرز کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

یہ سن کر اجنبی کا چہرہ غصے سے سیاہ ہو گیا۔

"میں سودا کرنے نہیں آیا..... اپنا حق مانگ رہا ہوں!....." وہ غصے سے بولا۔

"تم خود جاؤ گے یا میں چپڑاسی کو بلاؤں؟"

میئر کو بھی غصہ آ گیا۔

"کسی کو بلانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں!" وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "تم مجھے صرف ایک بات بتاؤ.....!"

"جلدی بولو!..... اور کھسکو یہاں سے!" میئر نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "مجھے کچھ اور کام بھی کرنے ہیں!"

"تم مجھے ایک ہزار گلڈرز ادا کرو گے یا نہیں.....؟" اس نے گھور کر پوچھا۔

"بالکل نہیں.....!" میئر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"اب جو کچھ میں کرونگا..... وہ بھی دیکھنا۔" اس نے عجیب سے پراسرار انداز میں مسکرا کر کہا۔

"کیا کر لوگے تم میرا.....؟" میئر نے ہاتھ لہرا کر غصے سے کہا۔

"مجھے کیا کرنا ہے؟..... تم خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے..... جس کا ابھی تمہیں احساس نہیں.....!" اس نے کہا۔ "آخری بار کہہ رہا ہوں..... اپنا کیا ہوا وعدہ پورا کر دو..... ایک ہزار گلڈرز مجھے دے دو!..... ورنہ وہ کچھ ہو گا، جو تم نے نہ کبھی دیکھا ہو گا، نہ سنا ہو گا.....!"

"تمہاری بکواس تو نہ جانے کب ختم

ہوگی؟..... " میئر غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے چلا کر چپڑاسی کو اندر بلایا۔ چپڑاسی فوراً اندر آگیا۔ اس نے غصے سے پچرنگی بانسری نواز کی طرف اشارہ کر کے حکم دیا۔ "اسے اٹھا کر باہر پھینک دو!" چپڑاسی نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ اور اسے دھکیلتا ہوا باہر لے گیا۔

میئر نے قہقہہ لگا کر اس کی نقل اتاری۔ " آخری بار کہہ رہا ہوں..... ایک ہزار گلڈرز مجھے دے دو..... ! ایک ہزار گلڈرز..... ہا ہا ہا.....! " اس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ فضا میں بانسری بجنے کی آواز سنائی دینے لگی..... یہ ایک عجیب سی دھن تھی..... ایسی دھن میئر نے آج سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی..... وہ بے اختیار اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا..... بانسری کی آواز میں عجیب سی کشش تھی..... اس کا دل اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا..... وہ بے اختیار آواز کی طرف لپکا..... دفتر سے باہر نکل کر اس نے دیکھا..... تھوڑی دور وہی پچرنگی بانسری نواز کھڑا اپنی عجیب و غریب بانسری بجا رہا تھا۔ ..... وہ آہستہ آہستہ بے خود ہونے لگا..... کچھ دیر پچرنگی بانسری نواز اپنی جگہ کھڑا وہی عجیب سی دھن الاپتا رہا..... پھر ایک طرف چل پڑا..... بانسری پر اب بھی وہی دھن بج رہی تھی..... وہ آگے آگے چلنے لگا..... اور میئر پیچھے پیچھے..... وہ چلتا رہا..... میئر بھی چلتا رہا..... بانسری بجتی رہی..... اور سفر طے ہوتا رہا..... بالآخر دریائے ویزر آگیا..... بانسری پھر بھی بجتی رہی.....

میئر آگے بڑھتا رہا..... بڑھتے بڑھتے، وہ دریا کے عین وسط میں پہنچ گیا..... ایسے میں اچانک ہی بانسری خاموش ہو گئی..... اور میئر جیسے نیند سے جاگا ..... بانسری جیسے ہی خاموش ہوئی، وہ مکمل ہوش میں آگیا..... پھر کیا تھا؟..... وہ چیخنے لگا..... چلانے لگا..... منتیں کرنے لگا..... معافیاں مانگنے لگا..... اور دریا کے گہرے اور منہ زور پانی میں ڈوبنے ابھرنے لگا.....

پچرنگی بانسری نواز دریا کے کنارے کھڑا افسوس سے سر ہلا رہا تھا۔

میئر نے اس کے آخری الفاظ سنے..... وہ کہہ رہا تھا..... " آئی ایم سوری دوست.....! میں دھوکے بازوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا ہوں۔ میئر آخری بار ابھرا..... پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دریائے ویزر کی لہروں میں غائب ہو گیا..... ○ —— ☆ —— ○

جگانے والا پلنگ

امریکہ میں ایسے پلنگ تیار کئے جا رہے ہیں جو زیادہ دیر تک سونے والوں کو وقت پر بیدار کر دیتے ہیں۔ ان میں گھڑی کے ساتھ بجنے والا الارم لگا ہوتا ہے جو ٹھیک وقت پر زور سے بجتا ہے اور اگر سونے والا پھر بھی نہ اٹھے تو وہ اس شخص کو پیروں کے بل کھڑا کر دیتے ہیں۔

مرسلہ..... محمد عمر سومرو. خیر پور سادات

بچّے کا خواب (نظم)

حافظ مظفّر محسن

میں پریوں کے پیارے پیارے دیس میں اک دن جاؤں گا
کچھ پریاں اور کچھ جِن لے کر اپنے دیس میں آؤں گا
ایسے کپڑے لاؤں گا جو میرے مہماں چاہیں گے
ان کی فرمائش کے کپڑے درزی سے سِلواؤں گا
میرے ہمراہ جائیں گے وہ سڑکوں پر لاہور کی
بیٹھیں گے وہ تانگے میں، پھر ان کو سیر کراؤں گا
سیر سپاٹا ہو جائے تو ہوٹل میں ہم جائیں گے
چاٹ، سموسے، مکھن، برگر ان کو میں کِھلواؤں گا
ڈرتے ہیں جو بچّے جِن سے، گھبراتے ہیں پریوں سے
ان بچّوں کو میں پریوں سے اور جِن سے مِلواؤں گا
باغوں میں ہم جائیں گے اور آنکھ مچولی کھیلیں گے
شام ڈھلے جب تھک جائیں تو شربت بھی پِلواؤں گا
کتنا اچھا دن گزرے گا اور جب سورج ڈوبے گا
اپنے پیارے مہمانوں کو اُن کے گھر پہنچاؤں گا
میں پریوں کے پیارے پیارے دیس میں اک دن جاؤں گا
کچھ پریاں اور کچھ جِن لے کر اپنے دیس میں آؤں گا

ان سے تعاون کیجیے ان پر اعتماد کیجیے

وطنِ عزیز کے قریے قریے
اور نگر نگر
ہر ماہ باقاعدگی سے
آنکھ مچولی
پہنچانے کے لیے ہم نے
ان اداروں
کو اپنا باقاعدہ
ایجنٹ
مقرر کیا
ہے

محمد حسین برادرز	کراچی	۷۷۲۴۱۲۶
سلطان نیوز ایجنسی	لاہور	۵۸۲۴۹
تاج محمد	راولپنڈی	۵۵۴۳۲
مہران نیوز ایجنسی	حیدرآباد	۲۰۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی	پشاور	۶۲۵۱۵
اے ایس حامد نیوز سروس	ملتان	۴۳۳۱۰
فیاض بک ڈپو	فیصل آباد	۲۷۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز	کوئٹہ	۷۵۰۰۲
اسلم نیوز ایجنسی	گوجرانوالہ	
سلمان برادرز	نواب شاہ	۲۴۱۴
سعید بک اسٹال	گجرات	۳۶۳۹
پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال	سرگودھا	۶۲۹۵۱
طاہر نیوز ایجنسی	جہلم	
کیپٹل نیوز ایجنسی	بہاولپور	۲۹۵۷
چوہدری امانت علی اینڈ سنز	رحیم یار خان	۷۲۶۲۶
مسلم بک ڈپو	سرائے عالمگیر	
رحمت بک اسٹال	اوکاڑہ	
رہبر نیوز ایجنسی	منڈی مدرسہ ضلع بہاول نگر	
ملک اینڈ سنز	سیالکوٹ	۸۷۹۸۹
سلطانی نیوز ایجنسی	چکوال	
مولا بخش نیوز ایجنسی	مہران مرکز سکھر	
خالد بک اسٹال	گجرات	۳۷۳۱
اسلامی نیوز ایجنسی	وہاڑی	۲۸۸۹

آنکھ مچولی
خریدنے کے لیے
اپنی تجاویز اور مشوروں کیلئے

ان ناموں پر اعتماد کیجیے

خط و کتابت کے لیے ماہ نامہ **آنکھ مچولی**، ۱۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

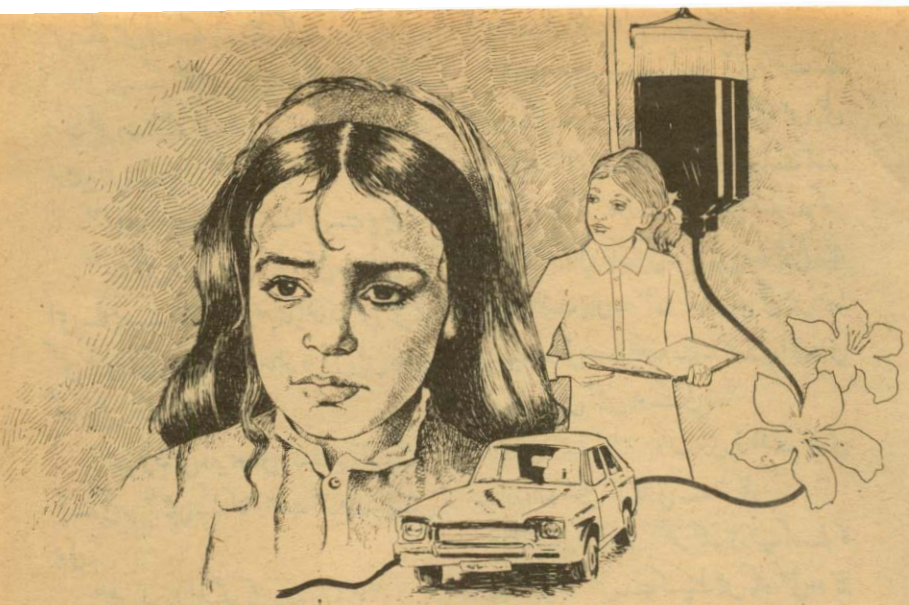

دوستی

عالیہ صلاح الدین

جھینپی جھینپی سی الفت سے میری ملاقات اسکول کی ایک تقریب میں ہوئی تھی۔ وہ بالکل الگ تھلگ میز کرسی پر بیٹھی کولڈ رنک کے ہلکے ہلکے سپ لے رہی تھی۔

میری سہیلیاں ابھی نہیں آئی تھیں اس لئے میں الفت کی میز پر چلی آئی اور اس سے اجازت لینے کے بعد ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ پھر میں نے ہی اس سے باتوں کا آغاز کیا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے ایک سال جونیئر ہے اور اسکول کی اس تقریب میں اپنی عزیز سہیلی نازیہ (جو کہ میری بھی دوست تھی) کے بیحد اصرار پر پہلی دفعہ شریک ہوئی ہے۔

الفت کو نازیہ کا انتظار تھا اور مجھے اپنی سہیلیوں کا، تھوڑی دیر بعد چونکہ میری سہیلیاں آگئیں،

اس لئے میں ان کے پاس چلی گئی۔

تقریب کے اختتام پر میں نے الفت کو اسی جگہ بہت فکر مند بیٹھے ہوئے پایا۔ اسے فکر مند دیکھ کر میں اس کے پاس آگئی۔

"کیا ہوا الفت؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"پتہ نہیں نازیہ کیوں نہیں آئی۔ حالاں کہ اسی نے میرے ساتھ پروگرام بنایا تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح پہنچ جاؤں پھر ہم ساتھ ہی بس میں واپس گھر جائیں گے!!"

"اب تو خاصی دیر ہو چکی ہے نازیہ تو اب نہیں آئے گی۔" میں نے کہا تو الفت فکر مند لہجے میں بولی۔

"میں اب اکیلے گھر کیسے جاؤں گی؟"

"تمہارا گھر کہاں ہے؟" میں نے الفت سے سوال کر ڈالا۔

"نارتھ کراچی میں۔" مختصر سا جواب ملا۔

"ٹھیک ہے میں تمہیں ڈراپ کر دوں گی۔" میں نے کہا تو الفت جلدی سے بولی۔ "نہیں نہیں ..... میں بس سے چلی جاؤں گی بلکہ مجھے اب چلنا چاہئے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو میں نے جھٹ سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "چلئے جناب! نارتھ کراچی میرے گھر کے راستے میں ہی پڑے گا۔" میں الفت کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی کار تک لے آئی اور پھر بڑے جھجکتے ہوئے انداز میں وہ میرے ساتھ کار میں بیٹھ گئی۔ گاڑی چل پڑی تو اپنی باتونی طبیعت کی وجہ سے میں نے اس سے باتیں شروع کر دیں، جن کا وہ ہوں ہاں میں جواب دیتی رہی۔

کچھ ہی دیر بعد ایک کچی آبادی آگئی تو الفت نے گاڑی رکوالی۔ "بس یہیں روک دیجئے میں چلی جاؤں گی۔" اس نے جلدی سے ڈرائیور سے کہا۔

"بابا! تم اپنے گھر کا راستہ سمجھاؤ گاڑی تمہارے گھر کے سامنے رکوائی جائے گی۔" میں نے شوخ لہجے میں کہا تو الفت بولی۔ "وہ سامنے ہی گلی میں میرا گھر ہے اور گلی بہت تنگ ہے۔ تمہاری اتنی بڑی کار وہاں داخل نہیں ہو سکے گی۔"

ڈرائیور نے گاڑی روک دی تو الفت جلدی سے دروازہ کھول کر گاڑی سے اتر گئی

"اچھا خدا حافظ ..... گھر تک ڈراپ کرنے کا بہت شکریہ!" اس سے کہ پہلے میں کچھ کہتی وہ تیز تیز قدموں سے گلی میں مڑ گئی۔

عجیب لڑکی ہے ..... گھبرائی گھبرائی اور پریشان سی، لیکن پھر بھی وہ مجھے بے حد اچھی لگی اور پھر گاڑی چل پڑی تو میں شیشے سے باہر کا نظارہ کرنے لگی۔

الفت سے دوسری ملاقات لائبریری میں ہوئی۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو اس نے مجھے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا۔ تب میں نے یاد دلایا کہ تقریب والے دن میں نے اسے لفٹ دی تھی۔

"اوہ! ہاں یاد آگیا ..... لیک بار پھر بہت شکریہ ..... اچھا میں چلتی ہوں۔ اردو کا پیریڈ شروع ہونے والا ہے۔" اس نے جلدی سے میز پر بکھری ہوئی کتابیں سمیٹیں اور تیز تیز قدموں سے چلتی بنی۔

اس کے بعد میری الفت سے کوئی تین چار بار مزید

ملاقات ہوئی لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ ہر بار مجھ سے کتراتی ہے۔ کترانے کی کوئی معقول وجہ میری سمجھ نہیں آئی تو میں نے ایک دن پوچھ ہی لیا۔

"تم آخر مجھ سے دوستی کیوں کرنا چاہتی ہوں۔" الٹا اس نے مجھ سے ہی سوال کر ڈالا۔

"اس لئے کہ تم میری ہم عمر ہو۔ ہم ایک ہی اسکول میں پڑھتے ہیں پھر میری سہیلی نازیہ تمہاری دوست ہے ..... تو کیا میں تم سے دوستی نہیں کر سکتی؟"

"کر تو سکتی ہو لیکن ہماری دوستی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

"وہ بھلا کس طرح؟" میں نے پوچھا

"وہ ایسے کہ میں ایک غریب ماں باپ کی بیٹی ہوں اور تم ایک بہت امیر لڑکی ..... تم سے دوستی ہوگی تو تم مجھے چیزیں کھلاؤ گی پھر مجھے بھی تمہیں چیزیں کھلانا ہوں گی ..... تم تو یہ سب کر لوگی پر میں یہ سب نہیں کر سکوں گی اس لئے کہ میری اتنی حیثیت نہیں۔"

"تم آخر ایسا کیوں سوچتی ہو۔ دوستی کھانے پینے کا نام تو نہیں یہ تو ایثار و قربانی کا نام ہے۔" میری یہ بات سن کر الفت نے کندھے اچکائے پھر کہا۔ "میں بڑی مشکلوں سے اس اسکول میں پڑھ رہی ہوں اور مجھے پڑھ لکھ کر اپنے ماں باپ کے ارمانوں کو پورا کرنا ہے ..... اور ویسے بھی کبھی مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگا ہے اس لئے ہماری دوستی ہو ہی نہیں سکتی۔" اتنا کہہ کر وہ مجھے حیران پریشان چھوڑ کر تیز تیز قدموں سے چلی گئی۔

کترانے کی اصل وجہ اب سمجھ میں آگئی تھی، چنانچہ الفت سے دوستی کی خواہش اب اور شدید ہو گئی۔ میں دوستی کر کے اسے بتانا چاہتی تھی کہ دوستی تمام چیزوں سے بالاتر ہوتی ہے لیکن الفت مجھ سے دوستی کے لئے قطعاً تیار نہ تھی۔

اس دن اسکول جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، سر میں درد بھی ہو رہا تھا لیکن حساب کی کاپیاں چیک ہونا تھیں اس لئے میں اسکول چلی گئی۔

ہاف ٹائم میں نازیہ بھاگتی ہوئی آئی اور کہنے لگی "کیا تم مجھے قریبی ہسپتال تک چھوڑ سکتی ہو؟"

"خیریت؟" میں نے پوچھا۔ "وہ اصل میں آج صبح اسکول آتے ہوئے الفت کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ سر میں چوٹ آئی ہے اور کافی خون بھی بہہ گیا ہے۔ اسے خون کی ضرورت ہے۔ میں ہسپتال جا رہی ہوں تاکہ اپنا خون چیک کرا کے اسے دے سکوں۔"

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" میں نے گھبرا کر نازیہ سے کہا اور پھر ڈرائیور کو کہہ کر جلدی سے گاڑی نکلوائی اور نازیہ کو لے کر ہسپتال پہنچ گئی۔ الفت کو انتہائی نگہداشت کے شعبے میں رکھا گیا تھا اور اسے خون دینے کے لئے اس کے گروپ کا خون تلاش کیا جا رہا تھا جو ہسپتال میں اس وقت موجود نہیں تھا۔ نازیہ اور میں نے جلدی جلدی اپنا خون چیک کرایا تو میرا گروپ نمبر مل گیا۔ ڈاکٹر نے جلدی سے خون لیا اور الفت کو خون

چڑھایا جانے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی حالت خطرے سے باہر تھی لیکن وہ ابھی بے ہوش تھی۔

الفت کے امی ابو بھی ہسپتال آئے ہوئے تھے وہ خون کے لئے سخت پریشان تھے میں نے الفت کو اپنا خون دے دیا تو ان کی جان میں جان آئی۔ میں نے فون کر کے ابو کو بلوالیا۔ نازیہ کو گھر واپس جانا تھا اس لئے وہ تو چلی گئی۔ جب کہ ابو الفت کی دواؤں کے لئے بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ الفت کے امی ابو سمجھ رہے تھے کہ میں الفت کی کوئی گہری دوست ہوں لیکن ان کو کیا معلوم تھا کہ الفت تو مجھ سے دوستی رکھنے کی ہی روادار نہیں۔ کوئی شام چار بجے میں الفت کے امی ابو کو تسلی و تشفی دینے اور ضروری سہولیات کے انتظام کے بعد ابو کے ساتھ واپس گھر آگئی۔

دوسرے دن بازار سے پھل وغیرہ خریدے اور امی کے ساتھ ہسپتال پہنچی تو الفت کے امی ابو نے بڑی محبت سے میرا استقبال کیا۔

الفت ہوش میں تھی اور اس وقت جاگ رہی تھی۔ میں نے پھلوں کا لفافہ اس کے سرہانے رکھا پھر اس سے پوچھا۔ "اب کیسی طبیعت ہے؟"

"میں اب ٹھیک ہو۔" ہولے سے الفت بولی۔ میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم بہت جلدی ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

"میں بہت شرمندہ ہوں میں نے تمہیں غلط سمجھا..... میں سمجھتی تھی کہ دولت مند لوگوں کے دل محبت سے خالی ہوتے ہیں لیکن آج پتہ چل گیا کہ دولت محبت سے بڑی نہیں ہوتی۔ تم نے میرے لئے جس ایثار کا مظاہرہ کیا ہے اسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اتنا کہہ کر الفت نے اپنے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھا دیئے "کیا تم مجھ سے دوستی کرنا پسند کرو گی؟" آہستہ سے اس کے ہونٹ ہلے۔ میں نے الفت کے بڑھے ہوئے ہاتھ محبت سے تھام لئے۔ الفت رو پڑی۔ میں نے آنسو پونچھتے ہوئے اس کی آنکھ میں جھانکا تو وہاں میرے لئے تشکر، اپنائیت اور محبت کے روشن دیئے جل رہے تھے۔

قائداعظم نے فرمایا

○ اپنے اخلاق ہر صورت میں بلند رکھو، موت سے نہ ڈرو، ہمارا مذہب یہی سکھاتا ہے کہ ہمیں ہر وقت موت کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اسلام اور پاکستان کی عزت بچانے کے لئے ہمیں موت کا مقابلہ بہادری سے کرنا چاہئے۔ مسلمان کے لئے اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نجات نہیں ہو سکتا کہ وہ صداقت کی خاطر شہید کی موت مر جائے۔

(طلبہ سے خطاب لاہور ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء)

○ میں آپ کو مصروف عمل ہونے کی تاکید کرتا ہوں۔ کام۔ کام اور بس کام۔ سکون خاطر، صبر و برداشت اور انکساری کے ساتھ اپنی قوم کی سچی خدمت کرتے جایئے۔

(۱۵ نومبر ۱۹۴۲ء کو مسلم اسٹوڈنٹس کانفرس سے خطاب)۔

چل میرے کچھوے ٹمبکٹو

مسعود ملک

ہم بہت دیر تلک اِس تصویر کو دیکھتے رہے۔ مگر ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آخر کچھوے پر فوکسی کیوں سوار ہے۔ فوکسی پر کچھوا کیوں نہیں۔ جب کچھ بات نہ بنی تو دوستوں سے مدد طلب کی۔ ایک ساتھی نے اِسے گھورا۔ بولے۔ گاڑی کی مضبوط باڈی کا اشتہار لگتا ہے۔ دوسرے نے کہا۔ ہو سکتا ہے یہ ظاہر کیا گیا ہو کہ جیسے کچھوا اپنے خول میں محفوظ ہوتا ہے۔ سوار اس گاڑی میں محفوظ ہوتا ہے۔

"ارے کچھ بھی نہیں۔" تیسرے نے کہا۔ "کہیں جلدی پہنچنا ہو گا۔ فوکسی کچھوے پر کیوں سوار ہے۔ کچھوا فوکسی پر کیوں نہیں"

"لیکن سوال یہ ہے کہ آخر کچھوے کو نہیں۔" موصوف نے جواب دیا۔

"میاں جلدی فوکسی کو تھی آپ کا کیا خیال ہے؟

میرا رب دعا کا سننے والا ہے

سونے سے پہلے کی دعا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَللّٰهُمَّ بِاسْمِكَ اَمُوْتُ وَاَحْيٰى

اے اللہ! میں تیرا نام لے کر مرتا اور جیتا ہوں۔

کھانے سے پہلے کی دعا

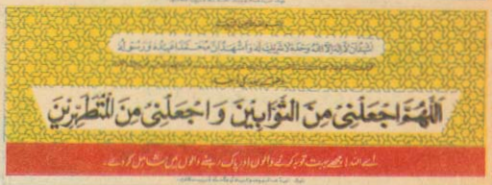

بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى بَرَكَةِ اللّٰهِ

میں نے اللہ کے نام سے اور اللہ کی برکت پر کھانا شروع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیت الخلاء جاتے وقت کی دعا

اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ

اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں خبیث جنوں سے مرد ہوں یا عورت۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جب سو کر اٹھے تو یہ دعا پڑھے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِىْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِىْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ

اے اللہ! مجھے بہت توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں میں شامل کر دے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گھر سے نکلنے کی دعا

بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گھر میں داخل ہونے کی دعا

اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْئَلُكَ خَيْرَ الْمَوْلَجِ وَخَيْرَ الْمَخْرَجِ بِسْمِ اللّٰهِ وَلَجْنَا وَعَلَى اللّٰهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اذان کے بعد کی دعا

اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلٰوةِ الْقَائِمَةِ اٰتِ مُحَمَّدَا الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَا الَّذِىْ وَعَدْتَّهٗ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کھانے کے بعد کی دعا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ

سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں کھلایا، پلایا اور مسلمان بنایا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیت الخلاء کے بعد کی دعا

غفرانک

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ اَذْهَبَ عَنِّى الْاَذٰى وَعَافَانِىْ

سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے مجھ سے ایذا پہنچانے والی چیز دور کی اور مجھے عافیت دی۔

آئینہ دیکھنے کی دعا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَللّٰهُمَّ كَمَا حَسَّنْتَ خَلْقِىْ فَحَسِّنْ خُلُقِىْ

اے اللہ! جیسے تو نے میری صورت اچھی بنائی تو میرے اخلاق بھی اچھے کر دے۔

سفر کی دعا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُبْحٰنَ الَّذِىْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَاِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ

اللہ سے رابطہ دُعا کے ذریعے ممکن ہے یہ وہ پکار ہے جو اللہ تعالیٰ سنتا ہے اور قبول کرتا ہے۔

ادارے نے ایسی ہی مسنون دُعاؤں کو خوبصورت اور دیدہ زیب اسٹیکرز میں چھاپا ہے۔ ایک مکمل سیٹ کا ہدیہ ۲۵ روپے رکھا گیا ہے آنکھ مچولی کے پتے پر ۲۵ روپے کا منی آرڈر بھیج کر آپ یہ دُعاؤں کا سیٹ منگوا سکتے ہیں۔ (ادارہ)

منگوانے کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی

انعامی مقابلہ

امتحان ہے آپ کی ذہانت کا

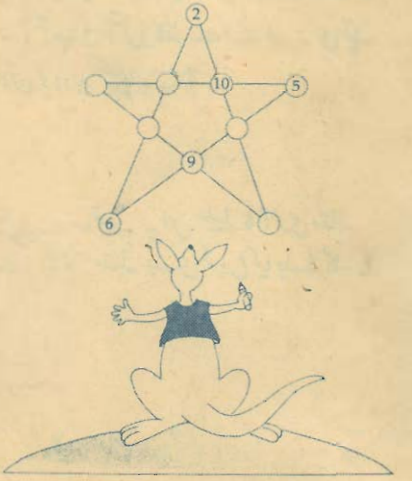

۱۔ دی گئی تصویر کے خالی خانوں میں ایسے ہندسے لکھئے کہ ہر لائن کے اعداد کا مجموعہ ۳۲ ہو۔ ایک ہندسہ دو بار نہیں لکھا جا سکتا۔

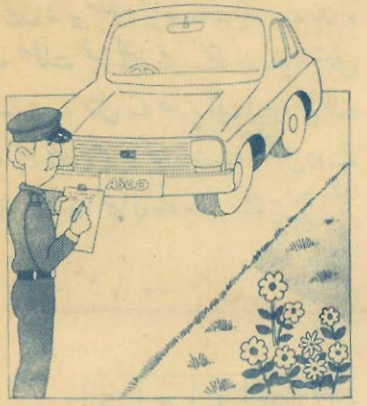

۲۔ ایک کار کا رجسٹریشن نمبر چار ہندسوں پر مشتمل ہے۔ اگر رجسٹریشن نمبر کے آخری دو ہندسوں سے بننے والے عدد کا مربع رجسٹریشن نمبر کے برابر ہو تو رجسٹریشن نمبر کیا ہوگا؟

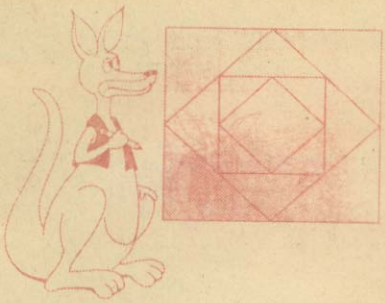

۳۔ حمیرا کے پاس ایک کتاب ہے، جس کے چار سو صفحے ہیں۔ ایک دن اس کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ یہ معلوم کیا جائے کہ ایک سے چار سو تک صفحات نمبر لکھنے میں کتنے ہندسے استعمال ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک سے دس تک صفحہ نمبر لکھے جائیں تو گیارہ ہندسے استعمال ہوتے ہیں۔ کیا آپ حمیرا کی کچھ مدد کر سکتے ہیں؟

۴۔ دی گئی تصویر بنائیے، اس شرط کے ساتھ کہ نہ تو آپ کی پنسل کاغذ سے اٹھے اور نہ ہی ایک لائن کو دو بار کھینچا جائے؟

(پیارے ساتھیو۔ یہ اس سلسلے کا آخری مقابلہ ہے۔ نیا کوئز مقابلہ جلد ہی شروع کیا جائے گا۔)

گذشتہ ماہ کے سوالوں کے درست جوابات:۔

۱۔

17	24	1	8	15
23	5	7	14	16
4	6	13	20	22
10	12	19	21	3
11	18	25	2	9

۲۔

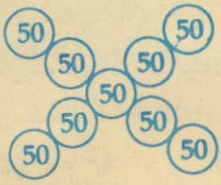

۳۔ مسافر ایک سڑک کی طرف اشارہ کر کے دونوں سے پوچھے گا۔ "کیا آپ اس گاؤں میں رہتے ہیں جو اس سڑک کے آخر پر واقع ہے۔" اگر دونوں ہاں کہیں تو ادھر سچوں کا گاؤں ہو گا۔ اور اگر دونوں نہیں کہیں تو جھوٹوں کا گاؤں ہو گا۔

۴۔ ۱، ۳، ۹، اور ۲۷ کلو کے باٹ۔

قرعہ اندازی کے ذریعے انعام حاصل کرنے والی خوش نصیب:۔

سُبل فصاحت، کراچی۔

بالکل درست جواب دینے والے ساتھی

فیصل عمران ڈوگر، کمالیہ۔ تیمور قریشی، کراچی۔ ملک محمد یونس، نواب شاہ۔ محمد حسن سروش، نواب شاہ۔ ملک محمد فاروق، نواب شاہ۔ ملک محمد یوسف، نواب شاہ۔ ساجد کمالوی۔ کمالیہ۔ انٹی حسنات، کمالیہ۔ یوسف قریشی، کراچی۔

ایک غلطی کرنے والے ساتھی

محمد شکیل، حیدر آباد۔ محمد سلیم رضا، لاہور۔ مولا بخش بلوچ، ساجن گوٹھ۔ احمر فرقان، ملتان۔ ابتسام ساجد، کمالیہ۔ محمد خالد آرائیں، نواب شاہ۔ محمد فہیم ضیا، محمد فرخ ضیا، محمد فیصل ضیا، بہاولپور۔ شبنم عقیل راجپوت، حیدر آباد۔ محمد بخش راہی، کراچی۔ صابر بھنبرو، کراچی۔ سیما عقیل راجپوت حیدر آباد۔

ایک سے زیادہ غلطیاں کرنے والے ساتھی:۔

اطہر رضا اجنبی، کراچی۔ سیدہ حنا نورین کاظمی، کراچی۔ صباحت حبیب خان، کراچی۔ سید ظہیر شاہ، میاں چنوں۔ محمد علی جواد، لاہور۔ ریحان طالب، ماسٹر عدنان عادل شیخ، حیدر آباد۔ شنید محمود میمن، حیدر آباد۔ مصحف رسول، کراچی۔ محمد کامران کریم شیخ، سکھر۔ پرنس سرفراز احمد، عاطف جمشید. فیصل مختار، ملتان۔ پرنس افضل شاہین، بہاولنگر۔ علی عمران زیدی، حیدر آباد۔ شہزاد گل، راجن پور۔ نوید محمود میمن، حیدر آباد۔ سلیمان، کراچی۔ سبھاش چندر، لاڑکانہ۔ سید علی فاروق جمیل دشت، رحیم یار خان۔ طارق علی یوسفی، حیدر آباد۔ رحمت اللہ بشیو گجرات۔ فرخ رشید خان، لاہور۔ محمد آصف عبد الرزاق میمن، میر پور خاص۔ عبد القدیر انڈھڑ، پنو عاقل۔

دُودھ کی بدولت

ریشم جیسے بال — نرم ملائم کھال

روشن روشن آنکھ — موتی جیسے دانت

کہتے ہیں کہ "صحت مند جسم صحت مند ذہن کی علامت ہے"

ماہرین برسوں کی تحقیق کے بعد دُودھ کو مکمل غذا اور صحت مند جسم کی ضمانت قرار دیتے ہیں۔

اللہ میاں نے دُودھ میں کیلشیم، پروٹین وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزا متوازن مقدار میں شامل کر دیے ہیں۔ یہی وہ اجزا ہیں جو اچھی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ہیں۔

اگر آپ نے ہر روز دو گلاس دُودھ پینا اپنی عادت بنا لیا تو گویا آپ نے صحت مندی کا راز پا لیا۔

دائی کی بات سنو

دُودھ پیو — مضبوط بنو

اشتہار برائے بہبود اطفال، منجانب آنکھ مچولی۔ کراچی

MASS

کنجوس کی فریاد

عبدالقادر

لوگو مجھے سنبھالو، برباد ہو گیا ہوں
پہنچا ہے دل کو صدمہ، ناشاد ہو گیا ہوں

اس راستے میں میرا اک پیسہ کھو گیا ہے
غم سے نڈھال میرا دل آج ہوگیا ہے

گھنٹوں تلاش اس کی کرتا رہا سڑک پر
ناکام ہوگیا تو حالت ہے میری ابتر

اب داستان اپنی جا کر کسے سناؤں؟
دل میں یہی ہے خدشہ، میں غم سے مرنہ جاؤں

منحوس تھا وہ انساں، دیکھا جسے سویرے
کچا اسے چبالوں، آئے جو ہاتھ میرے

سوراخ جیب میں ہے، معلوم مجھ کو ہوتا
میں آج اپنی دولت یوں روڈ پر نہ کھوتا

ہوتا رہا جو میرا گر اس طرح خسارہ
میں زندگی میں اپنا کیسے کروں گزارہ؟

آجائے موت اس کو پیسہ جو میرا پائے
مجھ غم زدہ کے دل کی لگ جائے اس کو "ہائے"

پیسے کا آرزو مند دنیا کا ہر بشر ہے
پیسہ ہی مجھ کو لوگو جاں سے عزیز تر ہے

پیسہ مرا کلیجہ، پیسہ مرا جگر ہے
پیسے پہ خواب میں بھی یارو مری نظر ہے

میں لکھ پتی بنا ہوں پیسے بچا بچا کر
کنجوس نام میرا ہے خلق کی زباں پر

غم کا پہاڑ مجھ پر ٹوٹا ہے آج لوگو
منہ سے نہ جا سکے گا اندر اناج لوگو

فریاد میری سُن کر مت قہقہے لگاؤ
پہلے ہی غم زدہ ہوں، دل اور مت دُکھاؤ

وہ کیا راز تھا؟

قسط نمبر ۴

محمد عمر احمد خان

جواد چھوٹے بھائی کے ہاتھ میں دستانے دیکھ کر ڈر گیا۔ پھر اس نے بھائی کو روکا جو کالے رنگ کی بدہیئت مکڑی کو مارنے جا رہا تھا۔ دارالحکومت کے سفر کے دوران ٹرین میں اس کے ساتھ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ اچانک اس کا ٹکٹ نمبر تبدیل ہو گیا۔ پھر شیر بہادر صاحب نے بتایا کہ یہ ان کی شرارت تھی۔ انہیں آٹھ نمبر پسند تھا اس لئے انہوں نے یہ ڈرامہ کیا۔ وہ نہایت دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔ پورے سفر کے دوران انہوں نے آنکھوں پر کالا چشمہ لگائے رکھا اور ہاتھوں کے دستانے بھی نہ اتارے۔ البتہ اسٹیشن پر اترتے ہی انہوں نے چشمہ اتارا تو جواد نے ان کی آنکھیں دیکھ لیں۔ جو کسی پرندے کی آنکھوں کی طرح گول اور پراسرار تھیں۔

اسلام آباد میں ٹھہرنے کے لئے انہوں نے جواد کو ہوٹل اسپا کا کارڈ دیا جو بعد میں ہوٹل اسپائڈر نکلا۔ جواد نے ہوٹل کے نمبر پر رنگ کیا تو صرف پانچ منٹ میں جانوروں کی تصویروں سے سجی ایک عجیب و غریب گاڑی اسے لینے اسٹیشن پہنچ گئی۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ گاڑی کے پہیے چار نہیں آٹھ تھے۔

اسلام آباد میں سخت سردی تھی لیکن گاڑی اندر سے نہایت آرام دہ اور گرم تھی۔ جواد نے نوٹ کیا کہ اس کے میزبان اور

ڈرائیور نے بھی ہاتھوں میں دستانے پہنے ہوئے ہیں اور آنکھوں پر کالا چشمہ لگا ہے۔ گاڑی چل پڑی تو کئی سوالات جواد کے ذہن کو پریشان کرنے لگے۔ اس نے ہوٹل کے میزبان سے سوالوں کے جوابات معلوم کرنے چاہے تو اس نے گفتگو کا رخ اس بات کی طرف موڑ دیا کہ دنیا عجائبات کا گھر ہے جو سامنے ہے دراصل وہ وہ.... نہیں۔ اسے دوسری آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے اس گفتگو نے جواد کو الجھا دیا۔

ہوٹل کے منیجر نے کمرے کی چابی جواد کو دی تو نیچے گر پڑی۔ ملازم نے گری ہوئی چابی اٹھا کر جواد کی طرف بڑھائی تو جواد خوف زدہ ہو گیا۔ ملازم کے ہاتھ میں آٹھ انگلیاں تھیں۔ منیجر نے ملازم کو ڈانٹا اور دستانے پہننے کی ہدایت کی۔ ملازم نے جواد کو کمرے تک چھوڑ دیا۔ کمرہ اندر سے نہایت آرام دہ اور خوب صورت تھا لیکن ہر چیز میں آٹھ کا ہندسہ نمایاں تھا دیواروں پر لگی تصویروں کی تعداد آٹھ، فانوس کے بلب آٹھ، میز کی ٹانگیں آٹھ ہر چیز آٹھ کے گرد گھوم رہی تھی۔ جواد چکرا کر رہ گیا۔

پھر جواد نے ہوٹل کے پراسرار ماحول سے گھبرا کر ہوٹل چھوڑنے کا فیصلہ کیا لیکن منیجر نے بتایا کہ باہر سخت طوفانی بارش ہو رہی ہے۔ سرد موسم اور موسلا دھار بارش کے سبب جواد کو ہوٹل میں رکنا پڑا۔ کھانا کھانے اور خوشبودار قہوہ پینے کے بعد اس پر غنودگی طاری ہو گئی تو وہ سو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کے ہاتھ پر بندھی گھڑی رات کے بارہ بجا رہی تھی۔

جواد نے یہ دیکھنے کے لئے کہ بارش رک گئی ہے؟ کھڑکی کھولی تو باہر اندھیرے میں سے کوئی چیز اڑتی ہوئی آئی اور اس کے چہرے سے ٹکرا گئی۔ وہ ایک چیخ مار کر کمرے میں بچھے قالین پر گر گیا؟! (اب آپ آگے پڑھئے)

گرتے گرتے اس نے کمرے کی مدھم روشنی میں دیکھا کہ بڑی بڑی جسامت کے حامل عجیب و غریب صورت والے پرندے کھلی کھڑکی کے راستے اُڑ اُڑ کر اندر آ رہے ہیں۔ ان کے پھڑپھڑانے سے کمرے میں ایک عجیب سی گونج پیدا ہو رہی تھی۔ جواد نے اُٹھنے کی کوشش کی تو کامیاب بھی ہو گیا لیکن عین اس وقت جب کہ وہ تقریباً کھڑا ہو چکا تھا کھڑکی سے آنے والا آخری پرندہ اس سے آ ٹکرایا اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے منہ کو بچاتے ہوئے دوبارہ نیچے گر پڑا۔ اس بار اس کے منہ سے خوف میں ڈوبی ہوئی چیخ نکلی لیکن بہت دبی دبی سی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے چیخ اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی ہو۔

جواد میز کے قریب گرا اور اتفاق سے اس کا ہاتھ گھنٹی پر لگا۔ گھنٹی بج اُٹھی اور ہوٹل کا ملازم کمرے کا دروازہ کھول کر تقریباً دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا۔ "کیا ہوا صاحب؟ خیریت تو ہے!"

اس نے سہارا دے کر جواد کو کھڑا کیا۔ اور قریبی بیڈ پر بٹھا دیا۔ اسے دیکھ کر جواد کی جان میں جان آئی۔ ملازم نے جلدی سے کھڑکی بند کی جس سے سرد ہوا کے جھونکے اندر آ رہے تھے پھر اس نے کمرے کی تمام لائٹیں جلا دیں، کمرہ روشنی سے جیسے جگمگا اُٹھا۔

چندھیائی آنکھوں سے جواد نے تیز روشنی میں دیکھا تقریباً ایک درجن کے قریب اُلّو اور طوطوں جیسی شکلوں والے پرندے میز، کرسی، فرش اور اس کے بیڈ کے پائنتی بیٹھے تھے۔ ان میں سے

کچھ اپنی گول آنکھوں سے اسے گھور رہے تھے جبکہ کچھ آنکھیں بند کئے اس طرح لاتعلق بیٹھے تھے جیسے مراقبہ کر رہے ہو۔ کبھی کبھی وہ چونچ سے اپنے گیلے پر کھجانے لگتے تھے۔

"یہ سب کیا ہے؟" جواد نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"یہ ہمارے باغ کے پرندے ہیں۔ بارش سے گھبرا کر کمرے میں چلے آئے ہیں۔ آپ بے فکر رہئے جیسے ہی بارش تھمے گی یہ واپس چلے جائیں گے۔"

"تو کیا یہ کمرے میں ہی رہیں گے۔ کیا تم انہیں یہاں سے نکالو گے نہیں؟" جواد کا لہجہ سوالیہ تھا۔

"جناب! یہ بے ضرر سے پرندے ہیں۔ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

"لیکن ان کی موجودگی میں، میں فی الحال اس کمرے میں نہیں رہ سکتا۔ مجھے جانوروں سے سخت چڑ ہے۔ کیا کوئی دوسرا کمرہ ارینج نہیں ہو سکتا۔" جواد نے منہ بناتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں..... ہو تو سکتا ہے۔" ملازم نے کہا اور پھر جواد کو دوسرا کمرہ دے دیا گیا۔ یہ دوسرا کمرہ بھی پہلے ہی کمرے کی کاپی تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کمرے میں پرندے نہیں تھے۔

ملازم کے جانے کے بعد جواد کافی دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا۔ وہ سخت پریشان تھا۔ اس نے "پراسراریت" کے موضوع پر بہت کچھ پڑھا اور سنا تھا..... اور اس طرح کی باتوں پر ہنسا کرتا تھا۔ کیوں کہ اسے ایسی باتوں پر یقین نہ تھا۔ لیکن اب اسے خود ایسے پراسرار واقعات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جو اس کے لئے نہایت حیرت انگیز تھے۔

دوسرے کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے جواد کی نظر اچانک دیوار پر لگی بڑی سی گھڑی کی طرف اٹھی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ گھڑی کی دونوں سوئیاں آٹھ کے ہندسے پر ٹھہری ہوئی ہیں۔ جواد نے ہاتھ پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ جواد کو یکدم یاد آیا کہ جب وہ ہوٹل آیا تھا تو اس وقت استقبالیہ پر موجود گھڑی کی سوئیاں آٹھ پر رکی ہوئی تھیں حالاں کہ اس وقت اس کے ہاتھ پر بندھی گھڑی میں کوئی بارہ بجے کا وقت ہو گا۔ جب کہ پرندوں والے کمرے کی گھڑی بھی آٹھ بجا رہی تھی۔

"یا اللہ! میں کہاں پھنس گیا..... یہ کیا چکر ہے.....؟ یہ کیا معاملہ ہے؟؟" جواد سر تھام کر بیڈ پر بیٹھ گیا..... اسے یاد آیا کہ ملازم نے رات میں بھی آنکھوں پر کالا چشمہ لگایا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں دستانے تھے پھر جواد کا خوف آہستہ آہستہ دور ہونے لگا کیوں کہ جو واقعات مسلسل تیزی سے اس کے ساتھ پیش آ رہے تھے وہ پراسرار ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی تھے اور دلچسپی اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

جواد نے اتنا تو اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ لوگ خاصے

پراسرار ہیں اور اپنی آنکھیں اور ہاتھوں کی انگلیاں چھپانے کے لئے کالے چشمے اور دستانے پہنتے ہیں لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ ان کی آنکھیں پرندوں کی طرف کیوں ہیں اور ہاتھوں میں آٹھ انگلیاں کس وجہ سے ہیں اور یہ کہ انہوں نے ہر چیز میں آٹھ کی قدر مشترک کیوں رکھی ہے؟ سوچتے سوچتے جواد کا ذہن شیر بہادر صاحب کی طرف چلا گیا۔ وہ سوچنے لگا۔

"شیر بہادر صاحب نے اسے ہوٹل اسپا کا کارڈ دیا تھا۔ انہوں نے آنکھوں پر کالا چشمہ لگایا تھا اور ہاتھوں میں دستانے بھی پہنے ہوئے تھے" پھر اسے یاد آیا کہ ٹرین میں شیر بہادر صاحب کے ساتھ اس نے جو کھانا کھایا تھا اس کا ذائقہ ہوٹل کے کھانوں کے ذائقوں جیسا تھا۔

جواد کی آنکھوں سے نیند اب اُڑ چکی تھی۔ وہ آلتی پالتی مار کر بستر پر بیٹھ گیا اور ٹرین سے شروع ہونے والے واقعات کی کڑیاں اب تک پیش آنے والے واقعات کی کڑیوں سے ملانے لگا تاکہ کوئی ایسا سرا ہاتھ میں آجائے جس سے وہ اس پراسرار معاملے کی تہہ تک پہنچ سکے۔ کافی دیر تک وہ اس موضوع پر سوچتا رہا لیکن اندھیرے میں تیر چلانے والی بات ثابت ہو رہی تھی۔ کوئی بھی ایسا سرا اس کے ہاتھ نہ آیا جس کی مدد سے وہ آگے کوئی پیش رفت کر سکتا۔ پھر اچانک ہی اسے کوئی خیال آیا تو اپنی جیب سے کمرے کی چابی نکال کر بغور معائنہ کرنے لگا۔ چابی ایک ہی تھی لیکن اس میں بھی آٹھ کا ہندسہ گردش کر رہا تھا۔ چابی میں آٹھ دندانے تھے۔ جواد کو یاد آیا کہ چابی کو لاک میں آٹھ بار گھمانے پر ہی لاک مکمل ہوتا تھا۔

"آخر ان لوگوں نے آٹھ کے ہندسے کو اتنی اہمیت کیوں دی ہوئی ہے؟" جواد کا ذہن آخری نکتے پر آکر ٹھہر گیا۔ "مجھے یہ راز معلوم کرنا ہوگا.....!!"

اس کے اندر کا مہم جو انسان بیدار ہو گیا۔

"ہوٹل کے ملازم سے پوچھا جائے تو شائد وہ اس سے پردہ اُٹھا سکے۔ کیا وہ مجھے یہ راز بتا دے گا؟؟" جواد کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ اپنے انٹرویو کی تیاری کو وہ بالکل بھول چکا تھا۔

"یقیناً ملازم ابھی جاگ رہا ہوگا؟ کیا مجھے گھنٹی بجا کر اسے بلانا چاہئے؟ ہو سکتا ہے وہ مجھے منع کر دے لیکن پوچھنے میں کیا حرج ہے.....!!" جواد نے سوچا پھر اس نے ہاتھ پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ سوا ایک بج چکا تھا۔ "صبح تک میں یہ ہوٹل چھوڑ دوں گا لیکن ہوٹل چھوڑنے سے پہلے پہلے مجھے آٹھ کے ہندسے کا راز ضرور معلوم کرنا چاہئے!!"

جواد نے راز پر سے پردہ اُٹھانے کا فیصلہ کر لیا ..... پھر کچھ ہی دیر بعد اس کی شہادت کی انگلی گھنٹی پر تھی اور گھنٹی کی آواز سے فضا لرز رہی تھی۔ ایک منٹ میں ہی ملازم دوڑتا چلا آیا۔

"خیریت جناب..... اب کوئی مسئلہ؟" اس کا لہجہ کہیں سے بھی نیند میں ڈوبا ہوا نہ لگتا تھا یوں

محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سویا ہی نہ ہو۔ "میں نے تمہیں نیند سے جگایا...... تم ڈسٹرب تو نہیں ہوئے؟" جواد نے کہا تو ملازم نے مسکراتے ہوئے چاق و چوبند لہجے میں کہا۔

"بے فکر رہئے جناب! میں رات کو سوتا ہی نہیں۔"

"کیوں کیا تمہیں نیند نہیں آتی؟"

"آتی ہے جناب! لیکن میں دن میں سونے کا عادی ہوں بلکہ ہم سے کافی لوگ دن میں سونے کے عادی ہیں۔"

"اچھا......!!" جواد کے لہجے میں خاصی حیرت تھی۔ کچھ دیر تک جواد خاموش رہا پھر اس نے اچانک ہی ملازم سے کہہ دیا۔ "کیا تم سب لوگ کچھ عجیب و غریب نہیں؟؟"

ملازم کو توقع نہ تھی کہ جواد اچانک یہ سوال کر دے گا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہوئیں پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"عجیب و غریب تو دنیا کی ہر چیز ہے...... بس جناب! لوگ غور و فکر ہی نہیں کرتے۔ آنکھیں کھلی رکھنے کے باوجود ہم کچھ دیکھ نہیں پاتے...... ان باتوں کو جاننے کے لئے دوسری آنکھ کا ہونا بہت ضروری ہے...... بالکل اس طرح کی آنکھوں کا......!!" ملازم نے.......... بات کرتے ہوئے اچانک ہی آنکھوں پر سے چشمہ اتار لیا۔ جواد اس کی آنکھیں دیکھ کر ایک دم سے خوف زدہ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بالکل ان پرندوں کی طرح تھیں جو دوسرے کمرے میں موجود تھے۔

ملازم نے دوبارہ آنکھوں پر چشمہ لگالیا۔

"آپ اس راز کو نہ ہی معلوم کریں تو آپ کے حق میں بہتر ہو گا......" ملازم کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ پھر اس نے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "سوا ایک بج رہا ہے...... میرے خیال میں اب آپ کو سو جانا چاہئے۔ صبح آپ کا انٹرویو بھی ہے۔" جواد نے یہ سن کر دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھا۔ جس گھڑی میں ابھی کچھ دیر پہلے آٹھ بج رہے تھے، اب وہاں سوا ایک بج رہا تھا۔ جواد نے جلدی سے اپنے ہاتھ کی گھڑی کی طرف نظر دوڑائی تو حیران رہ گیا اس کی گھڑی اب آٹھ بجا رہی تھی............!!

جواد حیرت میں ڈوبا ہی ہوا تھا کہ اسے ملازم کی آواز سنائی دی جو کہہ رہا تھا "ارے! یہ آواز کہاں سے آرہی ہے؟" جواد نے آواز کی طرف کان لگا دیئے۔ کِر کِر کِر...... کِر کِر کِر......!! آوازیں اس کے بستر پر سے آرہی تھیں۔ جواد نے جلدی سے ملازم کے ساتھ ساتھ اپنی نگاہیں بھی بستر کی طرف گھمائیں اور پھر حیرت و خوف سے اچھل پڑا۔

اس کے بستر کی چادر پر...... سینکڑوں

کالے رنگ کی چھوٹی چھوٹی بدہیبت مکڑیاں

رینگ رہی تھیں............!!!

جاری ہے............ اس دلچسپ کہانی کے مزید سنسنی خیز اور پراسرار واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے......!!

ٹھیکہ اس نے میری جوؤں کا اٹھا رکھا ہے
میں نے اس طوطے کو یوں سر پہ چڑھا رکھا ہے

ادارہ

عکس ادھورے کیجیے پورے

اِس مقابلے میں ہم ہر ماہ کسی ایک شعبے سے تعلق رکھنے والی دُنیا کی دو معروف شخصیات کے ادھورے خاکے شائع کرتے ہیں۔ آپ کو ان شخصیات کو پہچاننا ہے اور ان کی وجہ شہرت بتانا ہے۔ آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے آئندہ ماہ ہم صحیح جوابات کے ساتھ ان لوگوں کے مختصر حالاتِ زندگی بھی شائع کریں گے۔ بالکل صحیح جواب دینے والے ساتھی کو تین ماہ کے لیے ماہنامہ آنکھ مچولی مفت ارسال کیا جائے گا۔ ایک سے زیادہ درست حل موصول ہونے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی کیا جائے گا۔ مقابلے میں شرکت کی شرائط مندرجہ ذیل ہیں۔

- جوابات الگ کاغذ پر صاف صاف تحریر کیے جائیں۔
- ہر ماہ کی دس تاریخ تک ادارہ کو موصول ہو جائیں۔
- جوابات کے ساتھ بھیجنے والے کا مکمل پتا ضرور ہو۔

ان تین شرطوں میں سے کسی ایک بھی شرط کے پُورا نہ ہونے پر جوابات کو مقابلے سے خارج کر دیا جائے گا!

پتا: انچارج انعامی مقابلہ "عکس ادھورے، کیجیے پُورے"
ماہنامہ آنکھ مچولی، ۱۰۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۷۵۸۰۰

گزشتہ ماہ کے
درست جوابات

محسن حسن خان

کسی بھی کرکٹ ٹیم کی میچ میں عمدہ کارکردگی کے لئے اس کا افتتاحی جوڑا اچھا ہونا بہت ضروری ہے۔ اوپننگ بیٹسمینوں میں خصوصاً محسن خان کی کارکردگی بطور اوپنر بہترین رہی ہے۔ محسن روشنیوں کے شہر کراچی میں پیدا ہوئے اور چھوٹی چھوٹی گلیوں سے اپنے کھیل کا آغاز کیا۔ دائیں ہاتھ سے دلکش اور جارحانہ اسٹروک پلے کا مظاہرہ کرنے والے محسن نے ایک طویل عرصے تک ملک کے لئے خدمات انجام دیں۔ انہوں نے پاکستان کی جانب سے ۴۸ ٹیسٹ میچوں میں حصہ لیا اور ۳۷ رنز کی اوسط سے ۲۷۰۹ رنز بنائے، جس میں ۷ سینچریاں اور ۹ نصف سینچریاں شامل تھیں۔ انہوں نے ۱۹۸۲ء میں لارڈز (انگلینڈ) میں ۲۰۰ رنز کی شاندار اننگ کھیلی جس میں ۲۳ خوبصورت چوکے شامل تھے۔ محسن خان ایک اچھے اسٹروک پلیئر ہونے کے باعث ون ڈے کرکٹ کے ایک بہترین بیٹسمین تھے۔ ان کی جارحانہ بیٹنگ کی وجہ سے کئی بار پاکستان کامیابیوں سے ہمکنار ہوا۔ انہوں نے پاکستان کی جانب سے ۷۵ ایک روزہ انٹرنیشنل میچز کھیلے اور ۱۸۷۷ رنز اسکور کئے جس میں ۲ سینچریاں اور ۸ نصف سینچریاں شامل تھیں۔

ظہیر عباس

ظہیر نے پاکستان کی جانب سے ۷۸ ٹیسٹ میچوں میں حصہ لیا اور ۵۰۶۲ رنز بنائے۔ جس میں ۱۲ سینچریاں اور ۳۰ نصف سینچریاں شامل تھیں۔ ان کی یادگار اننگ ایبسٹن میں رہی جہاں انہوں نے ۳۸ چوکے لگا کر ۲۷۴ رنز اسکور کئے اور ایک اننگ میں پاکستان کی جانب سے سب سے زیادہ چوکے لگانے کا ریکارڈ بنایا۔ ان کی اس اننگ کے باعث ان کو "ایشین بریڈ مین" کا خطاب ملا۔

ایک روزہ میچوں میں ظہیر نے پاکستان کی جانب سے ۶۲ دفعہ شرکت کی اور ۲۵۷۲ رنز بنائے جس میں ۷ سینچریاں اور ۱۳ نصف سینچریاں شامل تھیں۔ وہ پاکستان کی جانب سے ۷ سینچریاں بنانے والے تیسرے کھلاڑی ہیں۔ ظہیر عباس نے پاکستان کی جانب سے ۳ ورلڈ کپ مقابلوں میں حصہ لیا اور تقریباً ۵۰ کی اوسط سے ۵۹۷ رنز اسکور کئے۔ ون ڈے میچوں میں ظہیر عباس نے تین لگاتار سینچریاں اسکور کر کے ایک شاندار ریکارڈ بنایا تھا۔ یہ کارنامہ انہوں نے ۱۹۸۲ء میں بھارت کے خلاف انجام دیا تھا۔ پاکستان ہی کے ایک نوجوان بیٹسمین سعید انور نے اس سال شارجہ میں یہ ریکارڈ برابر کیا ہے۔

قرعہ اندازی کے ذریعے انعام حاصل کرنے والی خوش نصیب

صفیہ علی بخاری، حیدر آباد۔

درست جواب دینے والے ساتھی

اطہر رضا اجنبی، کراچی۔ پرنس افضل شاہین، بہاولنگر۔ عشرت اقبال صدیقی، کراچی۔ موہن لال کرشن مل، عمرکوٹ۔ جاوید اقبال کنہوری، حیدر آباد۔ رفعت سبحان، حیدر آباد۔ محمد نوید اقبال قریشی، حیدر آباد۔ محمد بخش راہی، کراچی۔ ہریش کمار دیو نداس، عمرکوٹ۔ محمد علی، خالد علی، رابعہ ممتاز، ملتان۔ محمد عبدالرحیم، ملتان۔ شاہد وسیم غفاری، ملت ٹاؤن۔ آفتاب عالم ضیا، کراچی۔ کاشف ضیا، کراچی۔ ایس ایم فاروق، کراچی۔ پروین رضا، لاہور۔ مولا بخش بلوچ، ساجن گوٹھ۔ محمد علی جواد، لاہور۔ نسرین منظور بھٹی، گوجرانوالہ۔ سید محمد نسیم نقوی، کراچی۔ تیمور قریشی، کراچی۔ سُبل فصاحت، کراچی۔ حماد عثمانی، کراچی۔ فرحان خالق، کراچی۔ عمران خالق، کراچی۔ صباحت حبیب خان، کراچی۔ آصف نصراللہ۔ غ۔ حسین، کراچی۔ روح اللہ سعدی، کراچی۔ محمد یاسر، محمد یاور، کراچی۔ جنید اختر، نوید اختر، کراچی۔ بینش اختر، ساہیوال۔ ندیم شاہد، خانیوال۔ حارث، شارب، وقاص، کراچی۔ زاہد احمد خان، کراچی۔ بابر فاروقی، کراچی۔ صائمہ متین، اسماسعید، کراچی۔ یاسر بن صغیر، عدیل احمد قریشی، بہاول پور۔ رومی فاروقی، زاہد علی، لاہور۔ بانو رضوی، فازی رضوی، مدیحہ رضوی، مہوش رضوی، راولپنڈی۔ حماد احمد بخاری، سیالکوٹ۔ اصغر، محمد ثاقب، محمد شاکر، محمد عامر، کراچی۔ محسن مدثر، عدنان، کاشف احمد، لاہور۔ شہزاد احمد، بہاولنگر۔ آصف احمد خان، عاصم احمد خان، دانش احمد خان، راولپنڈی۔ اسامہ احمد، طٰہٰ احمد، ممتاز احمد، اقبال ناصر احمد، کراچی۔ محمد صابر، مراد احمد، سلیم اختر، جاوید اختر، منظور احمد، ساہیوال۔ شکیل احمد، سیالکوٹ۔ مبشر احمد، کراچی۔ عمران احمد، ریحان احمد، منور حسن، اسلام آباد۔ ثنا تبسم، عائشہ صدیقی، کراچی۔ مونا، فاریہ، دانیال، اسلام آباد۔ وردہ، حنا، ہما، لاہور۔ شاہ زیب، پشاور۔ مریم صدیقی، رباب جعفری، ملتان، خالد اقبال، رضوان ثاقب، نوشہرہ، شبّر علی چنگیزی، کراچی، سرفراز احمد، شاہد ندیم، راولاکوٹ۔ ایاز خان۔ فوزیہ شمیم، قصور۔ نورین اشفاق، راحیل اشفاق، خانیوال۔ شازیہ، فوزیہ، عامر شہزاد، مخدوم پور، بشیر احمد۔ صغیر احمد، شبیر احمد شاہد سمندری، منیر احمد، سفیر احمد فردوس، کراچی۔

اچھوتا کاروبار

فاروق دانش

صوفی نیاز مند بڑے امیر کبیر شخص تھے۔ ان کے پاس باپ دادا کی چھوڑی ہوئی اتنی رقم تھی کہ وہ ساری عمر گھر بیٹھے آرام سے گزار سکتے تھے۔ ان کی عمر پچاس پچپن کے درمیان تھی۔ وہ مہتاب نگر میں اپنی بیگم کے ساتھ ایک قدرے بہتر مکان میں رہائش پذیر تھے۔ صوفی صاحب کے پاس کرنے کو کام نہ تھا اور یہی بے کاری ان کی بیگم کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ اس بات کو برا سمجھتی تھیں کہ کوئی مرد صرف باپ دادا کی چھوڑی ہوئی رقم پر تکیہ کئے بیٹھا ہے اور خود کچھ بھی نہ کرے۔ اسی وجہ سے وہ اکثر صوفی صاحب کو کام کرنے کے لئے اکساتی رہتی تھیں اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تیار ہو جاتے تھے، کیونکہ خود صوفی صاحب کو بھی کوئی اچھوتا کام کرنے کا شوق تھا۔ ایسا کام کہ دوسرے دیکھ کر دنگ رہ جائیں۔

صوفی صاحب صوفے پر تکیہ ڈالے، آرام

سے اخبار پڑھنے میں مصروف تھے کہ انہیں اپنی بیگم کی آواز سنائی دی، وہ گھریلو ملازم کلن کو ہدایات دے رہی تھیں کہ بازار سے یہ چیز لانا، وہ نہ لانا، وہ چیز لانا، یہ نہ لانا۔

جب کلن سودا لینے ان کے سامنے سے گزر کر جانے لگا تو صوفی صاحب نے اخبار آنکھوں کے سامنے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"اور سنو بھئی کلن! واپس آؤ تو ایک کلو رس ملائی لیتے آنا۔"

"کوئی ضرورت نہیں رس ملائی لانے کی۔" بیگم نیاز مند جو پیچھے سے آرہی تھیں، گرج کر بولیں۔ "تم جاؤ کلن!"

"آپ نے یونہی منع کر دیا بیگم!" کلن کے جانے کے بعد صوفی صاحب نے بیگم سے کہا۔ "آج ہمارا رس ملائی کھانے کو بے حد جی چاہ رہا تھا۔"

"بھاڑ میں جائیں آپ کے یہ الا بلا شوق۔" وہ گرجیں۔ "نہ کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے۔ جب دیکھو مٹھائی، جب سنو رس ملائی۔" وہ باقاعدہ چلانے لگیں۔ "کبھی کام کے بارے میں بھی سوچا ہے۔"

صوفی صاحب بیگم کے چلانے پر جھینپ سے گئے۔ وہ اپنی بیگم سے ڈرتے بھی تو تھے۔ "لیکن ہمیں کام کاج کی ضرورت ہی کا ہے، اللہ کیا دیا سبھی کچھ تو ہے ہمارے پاس۔" انہوں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بیگم کو جواب دیا۔

"ہاں ہے، لیکن بیٹھے بیٹھے خرچ کرنے سے تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ آپ کی مٹھی بھر دولت کب تک آپ کا ساتھ دے گی۔ سمجھے آپ!" ان کی بیگم غصے سے بولیں۔

"سمجھ گئے، بالکل سمجھ گئے۔" صوفی صاحب بے بسی سے بولے۔ "مگر بیگم، آپ خود ہی بتائیں کہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟ دفتر میں ہمیں کوئی رکھے گا نہیں۔ کسی دکاندار سے کہو تو وہ ہنس کر ٹال دیتا ہے کہ صوفی صاحب آپ کام کر کے کیا کریں گے!! آخر ہم جائیں تو کہاں جائیں۔"

بیگم سر پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگیں پھر بولیں۔ آپ ایسا کریں کہ اس علاقے کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلے جائیں۔ وہاں کچھ کام ڈھونڈیں۔ اگر کام نہ ملے، تو کچھ ایسی چیزیں لے آئیں جو یہاں نہ ملتی ہوں۔ اسطرح وہ یہاں بیچ کر ہم اپنا خرچہ نکال سکیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" صوفی صاحب نے اس طرح سر کو ہلا کر کہا جیسے ان کی سمجھ میں سب کچھ آگیا ہو۔ "جیسا آپ نے کہا ہے، ہم ویسا ہی کریں گے بیگم۔ مگر وہ ..... رس ملائی۔" ان کا ذہن ابھی تک رس ملائی میں اٹکا ہوا تھا۔

"جی بالکل!" صوفی صاحب نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔ مٹھائی ان کی کمزوری تھی اور صوفی صاحب کی بیگم نے مٹھائی منگوا دینے کی حامی بھر لی تھی۔ جب کلن رس ملائی لایا انہوں نے ڈبہ فوری طور پر جھپٹ لیا اور اس پر ٹوٹ پڑے۔

اگلی صبح ان کی بیگم نے انہیں سویرے ہی جگا دیا تھا۔ "فجر کی نماز پڑھ لیں اور پھر رختِ سفر باندھ لیں۔"

صوفی صاحب نے فجر کی نماز پڑھ کر ناشتا کیا پھر اچکن پہن کر تیار ہو گئے۔ ایک چھوٹا سا بیگ انہوں نے ہاتھ میں لیا اور چلنے لگے تو ان کی بیگم نے ایک پوٹلی ان کے ہاتھ میں تھما دی۔ "یہ ساتھ لے جائیں راستے میں بھوک لگے تو کھالینا۔"

انہوں نے بیگم کا شکریہ ادا کیا اور سفر پر روانہ ہو گئے۔

راستے میں صوفی صاحب نے سوچا کہ سب سے پہلے اپنے عزیز از جان دوست چچا نٹ کھٹ کے پاس جائیں، ان کے ہاں قیام کریں گے اور انہی کے شہر میں کوئی کام وام ڈھونڈیں گے۔

چچا نٹ کھٹ کا شہر زیادہ دور نہ تھا، بس درمیان میں ایک گاؤں سے ہو کر جانا پڑتا تھا۔ صوفی صاحب نے سوچا کہ فاصلہ کوئی زیادہ تو ہے نہیں، کیوں نہ پیدل ہی چلا جائے۔ اس طرح ٹانگیں بھی رواں ہو جائیں گے۔ یوں بھی ان علاقوں میں پیدل چلنے کا رواج کچھ زیادہ ہی تھا۔ لوگ ۵۰، میل کا سفر تو عمومی حالات میں پیدل ہی کر لیتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج کا بچّہ اتنا معمولی سفر بھی جہاز میں طے کرنا چاہتا ہے۔ جب صوفی صاحب گاؤں پہنچے تو وہ کافی تھک چکے تھے وہ ایک درخت کے نیچے لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر آرام کیا۔ تھکاوٹ میں کچھ کمی محسوس ہوئی تو پھر چل پڑے۔

یہ گاؤں بہت بڑا تو نہیں تھا لیکن آج ختم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ صوفی نیاز مند پھر کہیں آرام کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے کہ سامنے انہیں ایک دریا دکھائی دیا جس کے کنارے لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ وہ دریا کی طرف بڑھے۔ جب دریا کے کنارے پر پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ایک بچّہ جس کی عمر دس بارہ سال ہے بیچ دریا میں ڈوبنے سے بچنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ اور دریا کے کنارے کھڑے لوگ اسے حیرت سے دیکھ رہے ہیں شاید ان میں سے کوئی بھی تیراک نہیں تھا۔

صوفی صاحب گھبرا کر لوگوں کے چہرے ہی دیکھ رہے تھے کہ اچانک ایک شخص نے زور سے ربڑ کا ایک ٹائر لڑکے کی طرف اچھالا جو اس کے قریب جا گرا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، لڑکا شاید معمولی تیرنا جانتا تھا۔ اس نے لپک کر ٹائر کو پکڑا اور اپنے جسم میں ڈال لیا۔ پھر دو چار ہاتھ پاؤں مارے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ کنارے پر آگیا۔ لوگوں نے خوشی کے مارے زور زور سے تالیاں بجانا شروع کر دیں اور ٹائر والے کو خوب شاباش دی اور شکریہ ادا کیا۔ ٹائر والے نے بھی لوگوں کو شکریہ کہا اور اپنا ٹائر لے کر ایک طرف کو چل دیا۔

صوفی نیاز مند یہ عجیب و غریب منظر دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ سوچتے تھے کہ یہ ٹائر کتنا حیرت انگیز تھا۔ کیسے ایک ڈوبتے ہوئے بچّے کی جان بچا

لی۔ اس سے اچھی چیز اور کیا ہو سکتی تھی۔ ہمارے گاؤں میں بھی دریا ہے اور وہاں بھی اکثر بچے تیرتے ہوئے ڈوبنے بھی لگتے ہیں۔ اگر یہ ٹائر مجھے مل جائے تو پھر ہمارے گاؤں میں کوئی بچہ بھی نہیں ڈوبے گا۔

یہ خیال آتے ہی وہ ٹائر والے کے پیچھے بھاگے۔

"بھائی صاحب! ارے ٹائر والے بھائی صاحب! ذرا رکئے اور ہماری ایک بات سنئے۔" انہوں نے دور ہی سے ہانک لگائی۔

ٹائر والا رک گیا۔ "جی فرمایئے!"

"خاکسار کو صوفی نیاز مند کہتے ہیں۔ میں چچا نٹ کھٹ کے شہر جا رہا تھا، کوئی ایسی عجیب و غریب چیز لانے کے لئے، جو ہمارے گاؤں میں نہ ہو، اچانک آپ کے جادوئی ٹائر کا مکمل دیکھنے کو ملا۔ واہ صاحب واہ، کیا ایک آن میں آپ کے اس جادوئی ٹائر نے ایک بچے کو ڈوبنے سے بچا لیا۔" صوفی صاحب جوش میں کہے جا رہے تھے اور ٹائر والا صوفی صاحب کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ صوفی نہایت کم عقل شخص ہیں جبھی وہ ٹائر کو جادوئی چیز سمجھ رہے ہیں۔

"پھر، اب آپ کیا چاہتے ہیں؟" ٹائر والے شخص نے صوفی صاحب سے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"چاہتا کیا ہے!" صوفی صاحب بولے۔ "میں آپ کا یہ ٹائر" اپنے گاؤں لے جانا چاہتا ہوں۔ ہمارے علاقے میں دریا ہے، اور بچے بھی ہیں، لیکن کوئی ایسا جادوئی ٹائر نہیں ہے جس سے ڈوبنے والے بچوں کو فوری طور پر بچایا جا سکے۔ اس لئے آپ اپنا یہ ٹائر میرے ہاتھ فروخت کر دیجئے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا صوفی صاحب!" ٹائر والے آدمی نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"میاں کیوں نہیں ہو سکتا۔" صوفی صاحب بولے۔ "کون سا کام ہے جو نہیں ہو سکتا۔ ہم نے کہہ دیا ہے کہ ہمیں یہ ٹائر چاہئے بس....."

"مگر صوفی صاحب!" ٹائر والے نے مکاری سے کہا۔ "میں نے یہ ٹائر ایک جادوگر سے دس ہزار روپے میں خریدا تھا۔ آپ بھی اتنی رقم دے سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں دے سکتے۔" صوفی صاحب اکڑ کر بولے۔ وہ بیگم سے دس ہزار روپے لے کر چلے تھے انہوں نے دل میں سوچا کہ کتنا قیمتی ٹائر سستے داموں دام مل رہا ہے۔

انہوں نے فوراً اپنی اچکن کی جیب سے دس ہزار روپے نکالے اور ٹائر والے شخص کے حوالے کر دیئے۔ اور اس سے ٹائر چھین لیا۔ ٹائر والا دل ہی دل میں ہنستا مسکراتا ہوا ایک طرف کو چل دیا۔

صوفی صاحب نے ٹائر خریدنے کے بعد چچا نٹ کھٹ کے گھر جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا اور واپس اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ جس مقصد کے لئے وہ گھر سے نکلے تھے، وہ پورا ہو چکا تھا۔ راستے بھر میں وہ یہ سوچتے رہے کہ جب اپنے گاؤں کے لوگوں کو اس ٹائر کی حقیقت معلوم ہو گی تو وہ اسے

کرائے پر لینے آیا کریں گے، یوں ان کا کام چل نکلے گا اور بیگم کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی کہ وہ کوئی کام کریں۔

جب صوفی صاحب اپنے گاؤں پہنچے تو لوگوں نے انہیں ٹائر اٹھائے ہوئے دیکھا، تو حیرت سے پوچھا۔ "صوفی صاحب! یہ ٹائر کس لئے؟"

"یہ جادو کا ٹائر ہے۔ صوفی نیاز مند نے اکڑ کر بتایا۔ "اب کوئی بچّہ دریا میں نہیں ڈوبے گا۔ یہ ٹائر اسے فوراً باہر نکال لائے گا۔ زندہ سلامت۔"

اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے پورے ہی علاقے میں صوفی صاحب کے ٹائر کی شہرت ہو گئی لیکن مصیبت یہ تھی کہ تین چار روز گزرنے کے بعد باوجود کوئی بچّہ کوئی جوان دریا میں نہ گرا۔ اور لوگ صوفی صاحب کے جادوئی ٹائر کا کرشمہ دیکھنے کے لئے مچل مچل کر رہ گئے تھے۔

صوفی صاحب بھی ٹائر کو آزمانا چاہتے تھے۔ آخر تنگ آکر انہوں نے کلن پہ تجربہ کرنے کی سوچی، کلن نہ تیرنا جانتا تھا اور نہ ہی نہانے کا شوقین تھا۔ بہر حال! صوفی صاحب نے اسے کسی طرح اس بات پر آمادہ کر لیا۔ پھر یہ بات سارے علاقے میں مشہور کرا دی۔

کلن کے ساتھ جب وہ دریا پر پہنچے تو وہاں لوگوں کی بھیڑ لگ چکی تھی۔ صوفی صاحب نے ایک دو تین کہا اور کلن کو پروگرام کے مطابق دریا میں دھکا دے دیا گیا۔ جب وہ کافی دور نکل گیا تو صوفی صاحب نے اپنا جادوئی ٹائر اس کی طرف اچھال دیا۔ ہوا تیز تھی۔ ٹائر بجائے کلن کی طرف گرنے کے دوسری جانب گرا اور پانی کے تیز بہاؤ کے ساتھ کافی آگے نکل گیا۔ صوفی صاحب حیران رہ گئے۔ تمام لوگ صوفی صاحب کو کوس رہے تھے کیونکہ کلن کافی گہرے پانی میں جا چکا تھا۔

صوفی صاحب حیران پریشان تھے کہ کیا کریں، ایسے میں ایک تیراک نے دریا میں چھلانگ لگائی اور بڑی مہارت سے کلن کو باہر نکال لیا۔

"اگر میں یہاں نہ ہوتا تو آپ کی نادانی کی وجہ سے کلن ڈوب جاتا۔" تیراک نے غصے سے کہا۔

"ٹائر محض ربڑ ہونے کے باعث نہیں ڈوبتا۔ اس لئے اس تیرنا سیکھنے کے لئے استعمال میں لیا جاتا ہے۔" تیراک اب بھی غصے میں تھا۔ "اس لئے اس کے جادوئی ہونے میں کوئی حقیقت نہیں۔"

یہ کہہ کر تیراک اور دوسرے لوگ بھی صوفی صاحب کو برا بھلا کہتے ہوئے چلے گئے۔ مگر صوفی صاحب دریا کنارے کھڑے دیر تک سوچتے رہے۔ "شاید میں نے تمام لوگوں کو جادوئی ٹائر کی حقیقت بتا دی تھی اسی لئے اس کا اثر ختم ہو گیا۔ ورنہ میں نے خود اپنی ان آنکھوں سے اسے بچے کو ڈوبنے سے بچاتے ہوئے دیکھا تھا۔"

بنامِ آنکھ مچولی

قارئین کے مُنتخب خطوط

رضوان حسین نقوی، کراچی۔ اس بار کا شمارہ کافی لیٹ ملا سرورق مزیدار نہ تھا البتہ کہانیاں مزے دار تھیں۔ "فلسفی چوزہ" اور "وہ کیا راز تھا" بے حد دلچسپ رہیں۔ خاص کر بچوں کے انٹرویوز پسند آئے۔ مجموعی طور پر رسالہ کچھ پھیکا پھیکا لگا۔ نوید الرحمان، کراچی۔ مارچ کے شمارے میں "فلسفی چوزہ" "تم منصور ہو" اور "مجھے معاف کر دینا" اچھی کہانیاں تھیں۔ حماد عثمانی، کراچی۔ مجموعی طور پر رسالہ پسند آیا۔ خاص بچوں کے انٹرویوز نے متاثر کیا لیکن اس بار کلر ٹھیک نہیں لگے۔ عثمان عدیل، جہنم کینٹ۔ اس ماہ کی تمام کہانیاں پسند آئیں۔ سید طاہر رضا، جھنگ۔ مارچ کا شمارہ اپنی مثال آپ تھا۔ شرارت نمبر کے بعد یہ شمارہ بھی کافی اچھا لگا۔ لعل بخش شیخ، ماجھی پور۔ مارچ کے شمارے میں اپنا نام دیکھا تو دل خوشی سے قلابازیاں کھانے لگا۔ افتخار عالم، کراچی۔ مارچ کے آنکھ مچولی میں راحت صلاح الدین کی کہانی "ابو بہت اچھے ہیں" تمام کہانیوں پر بازی لے گئی معذور ہونے کے باوجود اتنی اچھی سوچ اور اتنی اچھی کہانیاں لکھنے والی راحت کا انٹرویو بے حد پسند آیا۔ میاں عبدالرازق، ملتان۔ اس بار لطیفے بڑے شاندار تھے۔ صفی علی بخاری، حیدر آباد۔ خاص بچوں کے بارے میں معلومات پسند آئیں۔ سید علی فاروق جمیل (؟) پہلی مرتبہ خط لکھ رہا ہوں امید ہے چھاپ کر شکریہ کا موقع دیں گے۔ برکت علی، سانگھڑ۔ میں نے اپنا نام برکت علی ہزارہ سے بدل کر "روگی" رکھ لیا ہے آئندہ مجھے اسی نام سے چھاپیے۔ ○ ..... بھائی! یہ آپ نے کیا روگ لگا لیا؟ رحمت اللہ بشیر گجرات۔ اس بار رسالہ کافی لیٹ ملا جس کی وجہ سے ہم مقابلوں میں شامل نہیں ہو سکے۔ عبدالرشید، حیدر آباد۔ "سنہرے حروف"، "ماہ رواں کی پہلی بات"، "ابو بہت اچھے ہیں"، "تم منصور ہو"، "معذور ڈاکٹر"، "مجھے معاف کر دینا"، "سہارے کی ضرورت"، "کاش میں معذور نہ ہوتا" اور "فلسفی چوزہ" نے بہت متاثر کیا۔ نظموں میں "لاریب فیہ"، "نابینا بچے کی نصیحت" اور "سردی کی ہے بات" لاجواب رہیں۔ معذور بچوں کے حوالے سے "سب سے خاص بچی" اور "آشیانے" پسند آئے۔ سید محمد طلحہ، اسلام آباد۔ مارچ کا شمارہ خاص بچوں کے حوالے سے

ایک خط ایک مسئلہ۔

جناب مدیر آنکھ مچولی

السلام و علیکم!

اس خط کے ذریعے آپ کی توجہ ایک اہم مسئلے کی طرف دلانا چاہتا ہوں اور وہ مسئلہ ہے "ایک خط ایک مسئلہ" کا۔ جناب! اب تک اس میں جتنے مسائل پیش کئے گئے وہ شائع تو کر دیئے جاتے ہیں لیکن کبھی ان کا حل نہیں بتایا جاتا۔ مثال کے طور پر جون ۹۳ کے شمارے میں ویڈیو گیم کا مسئلہ تو شائع کیا گیا لیکن اس کا حل نہیں بتایا گیا۔ ہمارے ہاں یہ بات عام ہے کہ لوگ غلطی کی نشاندہی تو کر دیتے ہیں لیکن اس کی اصلاح کوئی نہیں کرتا۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ "ایک خط ایک مسئلہ" میں مسائل پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا حل بھی شائع کریں۔ شکریہ!

جاوید اقبال کنہوری، حیدر آباد

تقریباً خاص بچوں کی نمائندگی کر رہا تھا۔ نظمیں اور کہانیاں لاجواب رہیں۔ راحت کا انٹرویو اور ان کی کہانی نے متاثر کیا۔ "توتے کس طرح باتیں کرتے ہیں"، "چیونٹی کا گیت" اور "کھلاڑیوں کی عید" دلچسپی کا سامان لئے ہوئے تھے۔ محمد بن مالک کی کہانی "فلسفی چوزہ" بے حد مزے دار تھی۔ عین الحق امین، کراچی۔ آپ کے رسالے میں حیرت انگیز تصویریں ہوتی ہیں جو مجھے پسند ہیں۔ مارچ کا شمارہ پسند آیا۔ سمیعہ نسیم چوہدری (؟) آنکھ مچولی کا خصوصی گوشہ بہت اچھا لگا۔ "ابو بہت اچھے ہیں" "چیونٹی کا گیت" "قیمتی لباس" اور "شاید چھت پر چڑیا ہو" اچھی کاوشیں تھیں۔ مولا بخش، کراچی۔ اس بار سرورق خاص نہ تھا البتہ کہانیاں بہت ساری اور بہت اچھی تھیں۔ راحت کا انٹرویو پڑھ کر ان کی ہمت کو داد دینے کو جی چاہا۔ ان کی امی اور نانی واقعی مبارک باد کی مستحق ہیں۔ قلم دوست میں بلا عنوان کہانیاں اور ریحان کا انٹرویو پڑھ کر مزہ آیا۔ "وہ کیا راز تھا" بڑے دلچسپ انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ اس بار شعر و شاعری کا سلسلہ غائب تھا۔ "ساتھی بچپن کے" کی طرح اسے بندمت کر دیجئے گا۔ ○ ..... شعر و شاعری کا سلسلہ اس بار شامل ہے۔ راؤ سجاد رشید، فیصل آباد۔

امّی کو کسی سے یہ کہتے سنا ہے میں نے کہ بہت شرارتی ہو گیا ہوں میں
ہو گئی ہیں خراب میری عادتیں پڑھا ہے جب سے شرارت نمبر کرتا ہوں میں شرارتیں

قاسم بن نظر، کراچی۔ آنکھ مچولی میں اپنی کہانی دیکھی تو یقین کریں اتنی خوشی ہوئی جتنی کلاس میں اوّل آنے پر بھی نہیں ہوئی تھی۔ شہریار گل، ارمڑ پایان۔ انکل! شرارت نمبر پڑھ کر دل چاہا کہ خوب شرارتیں کروں لیکن گھر والوں کی وارننگ کی وجہ سے شرارت نہیں کی ورنہ رسالہ پڑھنا بند ہو جاتا۔ محمد کاشف شیخ، کراچی۔ آنکھ مچولی کا شرارت نمبر بس گزارہ لائق تھا۔ اتنا شریر اور چلبلا نہیں نکلا جتنا ہم نے سوچا تھا۔ نوید انور، کراچی۔ شرارت نمبر کی شریر نظمیں پسند آئیں۔ پرنس افضل شاہین، بہاول نگر۔ خوبصورت سرورق اور مزیدار کہانیوں سے سجا شرارت نمبر بے حد پسند آیا۔ میری دعا ہے کہ آنکھ مچولی عروج حاصل کرے۔ آمین! محمد اسماعیل میرسانہ، ملتان۔ شرارت نمبر میں نعیم مشتاق نومی کی شرارت پسند آئی لیکن وہ بڑے ڈرپوک ہیں فوراً ہی بھاگ نکلے۔ حمیرا تبسم، ٹھٹھہ۔ انکل! اب آپ جلدی سے شیخو

پورہ چلے جائیں اور عاقب جاوید کا طویل انٹرویو لے لیں کیوں کہ وہ نیوزی لینڈ کے دورے پر نہیں گئے ہیں۔ محمد ایاز صدیقی، کراچی۔ انکل! میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ تعلیم اور ماحول کی آلودگی پر خاص نمبر شائع کریں۔ ○ ..... آپ کی تجویز نوٹ کرلی گئی ہے۔ ہما جبیں، مظفر گڑھ۔ آج کل ہر اخبار رسالہ قرآنی آیات یا ترجمہ بڑے دھڑلے سے شائع کرتا ہے اور بعد میں یہ صفحات سموسوں اور پکوڑوں کی دکان پر نظر آتے ہیں حالاں کہ رسائل و اخبارات والے یہ بھی لکھتے ہیں کہ قرآنی آیات آپ کی معلومات کے لئے شائع کر رہے ہیں ان کا ادب و احترام ضروری ہے لیکن کوئی بھی ان آیات کا احترام نہیں کرتا۔ آنکھ مچولی ہی کو لے لیجئے قرآنی آیتیں بھی شائع ہوتی ہیں اور ساتھ ہی نجس جانور کتے کی تصویر سرورق پر بھی دی جاتی ہے۔ لگتا ہے ہم صرف نام کے مسلمان رہ گئے ہیں..... !! محمد قاسم، سرگودھا۔ اداریئے میں بہت ہی اچھی اور قیمتی باتیں ہوتی ہیں۔ اللہ مدیر صاحب کی زندگی لمبی کرے۔ فدا حسین جلبانی، رمسو ڈیرو۔ جتنی بار آپ کو خطوط لکھے اتنی ہی بار آپ نے مایوس کیا۔ یہ میرا آخری خط ہے ○ ..... باہمت لوگوں کی کتاب میں "مایوسی" کا لفظ نہیں ہوتا۔ محمد یوسف جلبانی، رتو ڈیرو۔ خاص نمبر کی ہر نظم ہر کہانی مزے دار تھی۔ محمد عظیم قریشی، اسلام آباد۔ اب آپ کو خاص شمارہ میں سب سے بڑا نمبر نکالنا چاہئے جس کا عنوان ہو "آنکھ مچولی نمبر" اس کے علاوہ آپ "معلومات نمبر" "شخصیات نمبر" اور "جاسوسی نمبر" بھی شائع کریں۔ ○ ..... آپ کی تجاویز ہم نے نوٹ کرلی ہیں۔ آصف نصر اللہ، کراچی۔ شرارت نمبر کی ہر شرارت ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ ہماری آپ سے گزارش ہے کہ آپ ایسے نمبر شائع کرتے رہئے گا۔ ○ ..... آپ کی تجویز نوٹ کرلی گئی ہے۔ محمد مقیم اعظم جلبانی، رمسو ڈیرو۔ خاص نمبر کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ انیل عباس جلبانی بلوچ، رتو ڈیرو۔ فروری کے شمارے میں "شریر لڑکوں کی قوالی" "کھل نہ جائے میرا پول" اور "اچھا تو دنیا ایسی ہے" بے حد پسند آئیں۔ محمد سلیمان عامر، صوابی۔ خاص شمارے کی تمام کی تمام تحریریں پسند آئیں۔ مسعود، منصور احمد سومرو، گڈو۔ خاص شمارے کا سرورق کوئی خاص شرارتی نہیں تھا۔ اسی طرح کہانیاں بھی آدھی ہی پسند آئیں۔ ہرجیت سنگھ، مردان۔ شرارت نمبر کا سرورق حیرت انگیز تھا۔ ایک لڑکا شرارت کے موڈ میں ہے اور ایسا لگ رہا ہے کہ یہ ابھی کوئی شرارت کرے گا۔ میرے خیال میں یہ غبارہوں کے ساتھ کوئی شرارت کرنے کے موڈ میں ہے۔ شاہد علی، نارووال۔ شرارت نمبر بہت دلچسپ تھا۔ سہام رفیق خالطی، چاچڑاں شریف۔ فروری کے شمارے میں "شریر ہرن" اور "وہ کیا راز تھا" بے حد دلچسپ رہیں۔ عظمیٰ امین، ڈیرہ غازی خان۔ "شرارت نمبر" بے حد پسند آیا۔ عظیم اختر میمن، عدیم اختر میمن، میرپور خاص۔ شرارت نمبر کے بارے میں جیسا سوچا تھا ویسا نہ پایا۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑھ رہا ہے کہ شرارت نمبر پسند نہیں آیا۔ عابد انور، کراچی۔ شرارت نمبر لاجواب تھا۔ تمام تحریریں اچھی اور مناسب تھیں۔ شرارتی تصویروں اور کارٹونز نے شرارت نمبر کا مزہ دوبالا کر دیا۔ بچوں کے رسالوں میں فلمی اداکاروں کی تصاویر اور فیچر قطعاً نہیں ہونے چاہئیں اس سے نئی نسل کا رجحان تعلیم سے ہٹ سکتا ہے۔ مدیر اعزازی کا احتجاج بالکل درست ہے۔ محمد فاروق منیر، لاہور۔ ایسا لاجواب "شرارت نمبر" نکالنے پر بہت بہت مبارک باد قبول فرمائیں۔ عمر بلال، لاہور۔ اتنا شاندار..... اتنا خوبصورت..... اتنا اچھا..... شرارت نمبر..... آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت..... آپ کو مبارک باد۔ عدیل طارق، ڈیرہ غازی۔ شرارت نمبر بے حد شریر تھا..... ہر کہانی مزیدار تھی۔ جادوئی کھیل کی کتاب بے حد پسند آئی۔ پھگن کمار، گھوٹکی۔ آپ نے اگر میرا خط بنام آنکھ مچولی میں شامل نہ کیا تو میں رسالہ لینا بند کر دوں گا۔ ○ ..... اچھے لوگ دھمکیاں نہیں دیتے۔ عامر شاہ، کراچی۔ چند تحریریں بھیج رہا ہوں شائع کر دیجئے۔ شائع نہ کیں تو میں مزید تحریریں اور بھیج دوں گا اور ایک دن تنگ کر آپ کو شائع کرنی ہی پڑیں گی۔ ○ ..... پیارے! تنگ نہ کر۔

دوں۔ ○ ..... رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ! ایوارڈ دینے کب آرہے ہیں؟ محمد رضا، کراچی۔ میری تحریر اور خط نہ چھپا تو میں سمجھوں گا کہ رسالے میں مجھ جیسے غریب کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ○ ..... ہم سب بچوں کو اپنے دل میں جگہ دیتے ہیں اور یہ لیجئے آپ کو رسالے میں بھی جگہ مل گئی ہے۔ محمد ظہیر الدین بابر، شیشم خورد باغ۔ "شرارت نمبر" بہت پسند آیا۔ میری طرف سے آپ کو اور لکھنے والے ساتھیوں کو بہت بہت مبارک باد۔ ○ ..... آپ کو بھی مبارک باد۔ عامر خالق قریشی، ایبٹ آباد۔ شرارت نمبر کا شریر سرورق مزے دار تھا۔ کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں ہما شریف، کراچی۔ کبھی خط لکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا لیکن شرارت نمبر پڑھ کر ہاتھ خود بخود خط لکھنے کے لئے اٹھ گئے۔ خاص نمبر واقعی لاجواب تھا۔ عامر رشید، شیشم باغ۔ انکل! شرارت نمبر کے بعد اب آپ "سفر نمبر" نکالئے۔ صوفیہ سلطان، کراچی۔ امید ہے اتنا موٹا شرارتی نمبر نکالنے کے بعد آپ خیریت سے ہوں گے؟ ○ ..... جی نہیں! شرارت نمبر نکالنے کے بعد ہم دبلے ہو گئے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ آئندہ "دبلا نمبر" نکالیں۔ اطہر رضا اجنبی، کراچی۔ شرارت نمبر اپنی تمام تر رنگینیوں اور رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوا اور ہمارے ہاتھوں میں پہنچ کر شرارتیں کرنے لگا۔ ۲۴۸ صفحات پر مشتمل شرارت نمبر میں تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ کاشف بشیر کاشف، ساہیوال۔ فروری کا شمارہ شرارت نمبر کی صورت میں ملا۔ تحفہ پسند آیا۔ بنام آنکھ مچولی میں عمران خان یوسف زئی، پشاور کی تجاویز پسند آئیں۔ آپ فوراً کالم "انتظار فرمایئے" کا سلسلہ شروع کریں۔ وحید عامر، بوریوالہ۔ اگلے ماہ کے پہلے ہفتے میں انگلینڈ چلا جاؤں گا لیکن اس سے پہلے شرارت نمبر پر تبصرہ کرتا چلوں۔ شرارت نمبر حسب روایت پہلی تاریخ کو ہی مل گیا۔ سرورق بہت خوبصورت تھا جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ انتا پیارا سرورق میرے خیال میں پہلے شائع نہیں ہوا۔ تمام تحریریں بہت عمدہ تھیں لیکن تحفہ مجھے پسند نہیں آیا۔ اتنے پیارے رسالے کے ساتھ اتنا خراب تحفہ اچھا نہیں لگا۔ ○ ..... برادر! رسالے سے آپ کی محبت قابل ستائش ہے۔ تبصرے کا شکریہ۔ عبدالحفیظ کھوکھر، فیصل آباد۔ کچھ تحریروں کے ساتھ پہلی بار محفل میں حاضر ہو رہا ہوں۔ آپ رنگین صفحات انتہائی مہارت سے تیار کرتے ہیں۔ ○ ..... رنگین صفحات ہم نہیں ہمارے آرٹسٹ مومن رحیم تیار کرتے ہیں جو اس فن میں بہت ماہر ہیں۔ محمد حسن معظم، لاہور۔ میرے مضمون "کرکٹ" کا کیا بنا؟ ○ ..... آپ کوئی اور دلچسپ اور معیاری مضمون بھیجئے۔ محمد عمران سعید، بن قاسم (کراچی) میری پینٹنگز کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ ○ ..... آپ اچھی تصویریں بنا لیتے ہیں لیکن ابھی آپ کو مزید محنت کی ضرورت ہے۔ پڑھائی پر بھی پوری توجہ دیں۔ عمارہ احمد، لاہور۔ "تتلی" کو موضوعاتی رسالہ بنانا نئی سوچ تو ہے مگر یہ بہتر نہیں۔ اوّل تو ننھے منے بچے کسی ایک موضوع کے بارے میں سارا رسالہ پڑھیں، یہ مشکل لگتا ہے۔ چھوٹے بچے تو ہر لحہ نئی سوچ اور نئی دھن رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں ننھے منے ذہنوں کو موضوع کی قید میں نہ اتارا جائے۔ امتیاز علی میمن (؟) پہلی بار خط لکھ رہا ہوں۔ مجھے ہر مہینے آنکھ مچولی کا انتظار رہتا ہے۔ فریدہ کامران، کھیوڑہ۔ اس بار آنکھ مچولی کی کہانیاں اور لطائف بہت اچھے لگے۔ نوشین صدف، رحیم یار خان۔ میری پہلی کہانی ناقابل اشاعت قرار پائی اب یہ دوسری کہانی "منحوس" بھیج رہی ہوں۔ یہ تو ..... ○ ..... جی ہاں! یہ بھی ناقابل اشاعت ہے اب آپ کوئی اور اچھی مختصر سی کہانی لکھ کر ارسال کریں۔

دو ڈرائیور

عنبر چغتائی

گیندا سنگھ اور "بھائی غفورا" دیکھنے پہنچے عجائب خانہ
مصر کی ایک ممی کو دیکھا لاش، بھرا تھا جس میں مسالہ

پاس ہی تختی رکھی دیکھی جو دونوں نے ساتھ پڑھی
"ای پی سی گیارہ سو ستاسی" مرنے کی تاریخ تھی لکھی

گیندا سنگھ نے دیکھ کے پوچھا: "اس کا مطلب کیا ہے غفورا؟"
بولا "یہ نمبر ہے ٹرک کا جس سے یہ ٹکرا کے مرا تھا"

قصور میرا ہی تھا

نصیر الدین احمد

صبح کروٹ بدلتے ہی میری آنکھ کھل گئی۔

میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ امی باورچی خانے میں ہی تھیں۔ مگر آج پھر ابو میرے جاگنے سے پہلے جا چکے تھے۔ میں جھنجھلا کر رہ گیا، تین روز سے میں ابو سے بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر جب میں صبح اٹھتا تو وہ جا چکے ہوتے اور پھر نہ جانے رات کی کس گھڑی واپس آتے تھے کیوں کہ میں اس وقت تک سو چکا ہوتا تھا۔

میں امی کے پاس پہنچا۔ "میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ مجھے جگا دیجئے گا۔ ابو سے بات کرنی ہے۔"

"کیا بات کرنی ہے میرے لعل کو؟" امی نے پیار سے پوچھا۔

"بس ہے ایک بات۔ آج میں دیر تک

جاگوں گا۔ جب تک ابو نہ آ جائیں۔"

"اچھا ہم بھی دیکھتے ہیں کب تک جاگتے ہو۔" امی نے مسکرا کر کہا اور میں اسکول جانے کی تیاری کرنے لگا۔

ہمارے گھر میں افراد ہی کتنے تھے۔ میرے امی ابو، میں اور میری چھوٹی بہن۔ مجھے یہ تو پتہ نہیں کہ خوش حالی کسے کہتے ہیں۔ اگر پرسکون گھر کو خوشحال کہتے ہیں تو ہمارا گھر بہت خوش حال تھا۔ اس چھوٹے سے گھر کو امی نے بڑی محنت سے سجا رکھا تھا۔ مگر ابو جو اتنی محنت کرتے تھے میں کبھی کبھی ان سے اس بات پر ناراض بھی ہو جایا کرتا تھا۔ وہ کہتے "بیٹا میں یہ سب تمہارے لئے ہی تو کر رہا ہوں۔ میں تو پڑھ نہیں سکا۔ مگر چاہتا ہوں کہ تم پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بن جاؤ۔ کیوں بنو گے نا بڑے آدمی؟"

"ہاں میں ضرور بڑا آدمی بنوں گا۔" میں تن گر جواب دیتا اور ابو مسکراتے ہوئے مجھے گلے لگا لیتے۔

رات ہوئی اور میں نہ جانے کب انتظار کرتے کرتے سو گیا۔ پھر صبح امی کے اٹھانے پر ہی اٹھا۔

"اٹھو! ابو سے بات کر لو۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا اور دوڑتا ہوا ابو کے پاس جا پہنچا۔

"ابو ایک روپیہ نکالیں۔"

"ایک روپیہ۔ کیوں بھئی؟" ابو حیرت سے بولے۔

"مجھے شاباش ملی ہے۔ آپ نے کہا تھا نا کہ ایک شاباش پر ایک روپیہ۔"

"اچھا اس طرح تو ہم نقصان میں رہیں گے۔ بھئی تم تو ہر روز ہی شاباش لے کر آ جاتے ہو۔ اب سے تمہیں ایک شاباش پر پچاس پیسے ملیں گے۔"

"نہیں۔ آپ نے وعدہ کیا تھا۔ ایک شاباش پر ایک روپیہ۔" میں نے انکار میں سر ہلایا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

مجھے پڑھنے کا بھی جنون کی حد تک شوق تھا۔ اسکول میں میرا شمار ذہین طالب علموں میں ہوا کرتا تھا۔ ہر وقت ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب ہوا کرتی تھی۔ اکثر چھٹی کے دن بھی جب میں بستہ کھول کر بیٹھ جاتا تو ابو زبردستی کتابیں بند کرواتے اور کھیلنے کے لئے بھیج دیتے۔

جن دنوں آٹھویں جماعت کا رزلٹ آنا تھا۔ شہر میں بہت ہنگامے ہو رہے تھے۔ ابو کو بھی امی روکتی ہی رہ گئیں مگر وہ چلے گئے۔ میں نے بھی بڑی مشکل سے امی کو منایا اور کہا "اسکول قریب ہی تو ہے۔ بس رزلٹ لیتے ہی آ جاؤں گا۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"امی دیکھ لیجئے گا۔ آج ضرور میری اچھی پوزیشن آئے گی۔" میں نے جیسے لالچ دینا چاہا مگر امی کے پاس اس کا جواب بھی تھا۔

"اگر کل پرسوں چلے جاؤ گے تو پوزیشن ختم نہیں ہو جائے گی۔"

"امی بس رزلٹ لیتے ہی آ جاؤں گا۔"
میری ضد بدستور قائم تھی۔ آخر امی نے اجازت دے ہی دی مگر سختی سے تاکید کی کہ رزلٹ لیتے ہی سیدھا گھر واپس آؤں گا ادھر ادھر نہیں جاؤں گا۔

میں سر ہلاتا ہوا اسکول دوڑ گیا۔

جب رزلٹ ہاتھ میں آیا تو میں خوشی سے چیخ ہی اٹھا۔ میں نے پورے ضلع میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ رزلٹ لیتے ہی گھر کی طرف دوڑ پڑا۔ میرے تصور میں امی ابو کے ہنستے مسکراتے چہرے گھوم رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس دن میرا رزلٹ آنا ہوتا ابو دکان سے واپسی پر مٹھائی کا ڈبہ ضرور ساتھ لاتے تھے۔ حالانکہ میرا رزلٹ ان کو گھر آنے کے بعد ہی پتا چلتا تھا۔

"اکبر!" کسی نے مجھے آواز دی۔ میں چونک کر رک گیا۔ مڑ کر دیکھا تو وہ میرا کلاس فیلو سہیل تھا۔

"کیا بات ہے سہیل؟" میں نے اس کی پریشان صورت دیکھ کر کہا۔

"اکبر مارکیٹ میں ہنگامہ ہو گیا ہے۔"

"مارکیٹ میں ہنگامہ؟" میں نے اس کی بات دہرائی پھر مجھے یاد آیا کہ ابو تو مارکیٹ میں ہی ہوتے ہیں۔

"ابو تو ٹھیک ہیں نا!؟" میں بے چین ہو گیا۔

"معلوم نہیں مجھے خود ابھی پتہ چلا ہے۔"

میں نے رزلٹ جیب میں ٹھونسا اور مارکیٹ کی طرف دوڑ گیا۔ مجھے دور ہی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ ضرور کچھ نہ کچھ ہوا ہے۔ کیونکہ کافی ہجوم جمع تھا، لوگ اس ہنگامے پر اپنا اپنا تبصرہ کر رہے تھے۔ میں رش کو چیرتا ہوا مارکیٹ میں داخل ہو گیا میری نظر ابو کی تلاش میں دوڑنے لگی۔ دکان پر جب میری نظر گئی تو مجھے سوائے آگ کے کچھ نظر نہ آیا۔

"یا اللہ خیر۔" میرے دل سے بے اختیار دعا نکلی۔

پھر دوسرے ہی لمحے میری نظر ابو پر پڑی۔ وہ قریب ہی چبوترے پر اپنا سر تھامے بیٹھے تھے۔ میں ان کے قریب پہنچا مگر کچھ کہنے کی ہمت نہ ہو سکی ساری دکان اب راکھ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ہمارے لئے سب کچھ یہ دکان ہی تو تھی۔

میں نے ابو کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ انہوں نے دھیرے سے سر اٹھا کر دیکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے ایک نظر مڑ کر انہوں نے جلتی ہوئی دکان پر ڈالی پھر کہا۔ "چلو تمہاری امی گھر پر پریشان ہو رہی ہوں گی۔"

امی دروازے پر ہی مل گئیں۔ اور شاید ہمیں ایک نظر دیکھتے ہی ساری بات سمجھ گئیں جب ہی تو انہوں نے ایک سوال تک نہ کیا۔ گھر پر اچانک ہی ایسی خاموشی چھا گئی جیسے برسوں سے یہ مکان خالی پڑا ہو۔ چھوٹی بہن جو ہر وقت چیخ و پکار کر کے پورا گھر سر پر اٹھائے پھرتی تھی۔ وہ بھی آج خاموشی سے امی ابو کو تکے جا رہی تھی۔

"بھئی کیا آج کھانا وغیرہ نہیں پکایا۔ بھوکے ہی رہنا ہے۔" ابو نے خاموشی کو توڑا۔ میں نے ان کی طرف دیکھا وہ مسکرا رہے تھے پھر امی کھانا لگانے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

میں ابو کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ "ابو اب کیا ہو گا؟"

"کس کی بات کر رہے ہو؟" انہوں نے میری طرف دیکھا۔ "ہماری دکان جل گئی ہے نا۔" میں نے انہیں جیسے یاد دلایا۔

"ہاں جل تو گئی ہے مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ پریشان ہونے سے فائدہ؟ ہاں مگر اب آگے کے بارے میں سوچنا ہے۔ محنت کریں گے اللہ ضرور کامیاب کرے گا۔"

"ابو کیا آپ کو دکان کا افسوس نہیں ہے۔" مجھے ان کے رویے پر حیرت ہو رہی تھی۔

"کیوں نہیں مگر جیسی اللہ کی مرضی۔ اس کی طرف سے آزمائش ہے۔ دعا کرو اس آزمائش میں پورے اتریں ..... ارے ہاں یاد آیا بھئی آج تو تمہارا رزلٹ آنا تھا کہاں ہے؟"

میں تو رزلٹ بھول ہی گیا تھا۔ ابو کے پوچھنے پر مجھے یاد آیا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر مڑا تڑا رزلٹ نکال کر ان کے حوالے کر دیا۔

"ارے اس کا کیا حال کر دیا۔" انہوں نے اس کی حالت دیکھ کر کہا۔ پھر رزلٹ پر نظر پڑتے ہی وہ بولے۔ "بہت خوب۔ اے ون پوزیشن حاصل کی ہے۔ شاباش، تمہاری مٹھائی ادھار رہی لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ اسی طرح محنت سے پڑھتے رہنا تمہیں خوب محنت کرنا ہے ..... بڑا آدمی بننا ہے۔"

اس دن کا ایک ایک لمحہ ایک ایک بات میرے ذہن میں نقش ہے مجھے یاد ہے پھر کھانے کے بعد امی نے ایک پوٹلی لا کر ابو کے سامنے رکھ دی۔ "اس میں کیا ہے؟" ابو نے پوچھا۔

"زیورات ہیں اور کچھ رقم ہے۔ دکان کے لئے ضرورت پڑے گی۔ ان کو بیچ دیں۔" ابو خاموش رہے۔

"زیورات کا کیا ہے۔ دوبارہ بن جائیں گے۔ بس اللہ سے دعا ہے دکان میں برکت دے۔" ابو نے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں۔ "دیکھو پریشانی کا حل نکل آیا نا۔" مجھے پڑھنے کا شوق تو تھا ہی مگر اس دن کے بعد سے تو میں نے تہیہ کر لیا کہ بڑا آدمی بننا ہے اور ہر حال میں بننا ہے۔ میں پڑھائی میں گم ہو کر رہ گیا۔ خرچ کی مجھے اس لئے فکر نہ تھی کہ میں نے جب بھی گھر سے پیسے مانگے ابو نے کسی نہ کسی طرح کر کے مجھے دے دیئے۔ مگر ابو کی آمدنی ہی کتنی تھی۔ ایک چھوٹی سی پرچون کی دکان سے کتنی کمائی ہوتی تھی۔ جب تک میں پرائمری اسکول میں تھا میرا خرچہ کچھ بھی نہ تھا۔ مگر بڑی کلاس میں پہنچنے کے بعد میرا خرچہ تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

دسویں جماعت فرسٹ کلاس میں پاس کرنے کے بعد میں کالج پہنچ چکا تھا۔ اب تو میری دنیا

صرف کتابوں تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ نہ مجھے کھیل کود سے دلچسپی تھی نہ دوستوں سے اور نہ گھر سے۔ مجھے یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ ابو اب بیمار رہنے لگے ہیں۔ کئی کئی دن دکان بند رہا کرتی تھی۔ "امی مجھے پانچ سو روپے کی سخت ضرورت ہے۔"

"بیٹا اتنے پیسے کہاں سے لاؤں؟" "مجھے پرسوں تک فیس جمع کرانی ہے۔ اگر فیس جمع نہ ہوئی تو میں امتحان میں نہیں بیٹھ سکوں گا۔"

"اپنے ابو سے بات کر لو۔ میرے پاس تو نہیں ہیں۔" امی نے جان چھڑائی۔

شام کو ابو سے بات کی تو انہوں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد پانچ سو روپے نکال کر مجھے دے دیئے اور میں پیسے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ پیسے کہاں سے آئے تھے۔ کس لئے رکھے تھے اس کا اندازہ مجھے عید کے روز ہوا۔ اس دن امی ابو دونوں نے ہی پرانے کپڑے پہن رکھے تھے۔ مجھے شاید کچھ دیر کو افسوس ہوا۔ مگر سوچا کہ میری بھی تو فیس جمع ہونی تھی۔ اگر فیس جمع نہ ہوتی تو میں ایک سال پیچھے رہ جاتا۔ عید تو ہر سال ہی آتی ہے اب کے نئے کپڑے نہ بن سکے تو اگلے سال بن جائیں گے۔

نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ابو اب کچھ خاموش خاموش رہنے لگے ہیں۔ کچھ کمزور بھی ہو گئے ہیں۔ میں نے ایک دن امی سے پوچھ ہی لیا۔

"تمہارے ابو اب بیمار رہنے لگے ہیں۔ تمہاری پڑھائی تو نہ جانے کب ختم ہو گی۔"

"امی ابھی تو بہت پڑھائی باقی ہے۔ بڑے آدمی ایسے ہی تھوڑی بن جاتے ہیں آپ دیکھنا ایک دن آپ کا بیٹا ایک بڑا آدمی ضرور بنے گا۔"

"تم اپنے ابو کا ہاتھ بٹایا کرو۔" امی نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ "جب تک وہ بیمار ہیں تم دکان پر جایا کرو۔ ساتھ پڑھائی بھی کر لیا کرو"۔

"دکان پر بیٹھ کر تو پڑھائی ناممکن ہے۔ یہ دونوں کام تو ایک ساتھ ہو ہی نہیں سکتے۔ میرا سال ضائع ہو جائے گا۔ آپ کو تو پتا ہے کتنی مشکل پڑھائی ہوتی ہے۔ سارا سارا دن پڑھنا پڑتا ہے۔ اور اب تو میرے امتحان شروع ہونے والے ہیں۔ مجھے تو ایک لمحے کی فرصت نہیں ہو گی۔"

میرا گریجویشن کا آخری سال تھا۔ کالج میں آئے دن ہنگاموں کی وجہ سے پوری کلاسیں نہ ہو سکی تھیں۔ مجھے امتحان کی تیاری میں بہت دشواری ہو رہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ بہت سے لڑکوں نے کالج کے پروفیسرز سے بات کر لی تھی اور وہ ان کے گھر پڑھنے جایا کرتے تھے۔ اگر میں بھی ایسا ہی کر لوں تو کام بن سکتا ہے۔ مگر میں یہ بھی جانتا تھا کہ ان کی فیس بہت زیادہ ہو گی۔ لیکن یہ بات کر لینے میں کیا حرج تھا۔ ایک پروفیسر سے بات کی تو وہ پڑھانے پر راضی ہو گئے۔ مگر جب انہوں نے اپنی فیس بتائی تو میں چکرا کر رہ گیا۔ تین ہزار روپے میں

انہیں کیسے دے سکتا تھا۔ میں نے ان سے رعایت کی بات کی تو وہ کہنے لگے کہ میں نے پہلے ہی تمہیں دیکھ کر کم بتائے ہیں ورنہ امتحانوں کے دنوں میں تو فیس بہت زیادہ ہوتی ہے۔ مگر یہ سوچ کر کہ ابو اس ضرورت کو پورا کر ہی دیں گے میں نے ان کے پاس ٹیوشن کے لئے جانا شروع کر دیا۔ ٹیوشن پڑھتے ہوئے جب ایک ماہ سے کچھ زیادہ ہوئے تو ایک دن پروفیسر صاحب نے اشارے کنایے سے اپنی فیس کا ذکر کیا۔ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی بات یہ تھی کہ اب تک ابو سے بات کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ آخر میں نے ان سے بات کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

شام کو ابو کو اکیلا پا کر ان کے پاس پہنچا۔ "ابو مجھے کچھ روپوں کی ضرورت ہے۔" انہوں نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

"کتنے؟" ۔ "تین ہزار"

میں نے سر جھکا کر جواب دیا۔ چند لمحوں بعد میں نے سر اٹھا کر ابو کو دیکھا ان کی آنکھوں میں پریشانی جھانک رہی تھی۔ آج شاید میں نے پہلی بار ان کو پریشان دیکھا تھا۔ میری نظروں میں وہی منظر گھوم گیا۔ جب ہماری دکان جل گئی تھی اور ابو مسکراتے ہوئے مجھے رزلٹ پر مبارک باد دے رہے تھے۔

"وہ دراصل ابو میں ان دنوں ٹیوشن پڑھ رہا ہوں۔ کالج میں ہنگاموں....."

"کب تک چاہئیں؟" ابو نے بات کاٹ کر پوچھا۔ "آج ہی مل جائیں تو بہت اچھا ہے۔"

وہ اپنی چارپائی سے اٹھے اور صندوق سے تین ہزار روپے لا کر میرے حوالے کر دیئے۔ میرا تو سارا مسئلہ ہی حل ہو گیا تھا۔ صبح ہوتے ہی میں کالج گیا اور واپسی پر پروفیسر صاحب کے گھر کی طرف چل پڑا۔

"اکبر!" کسی نے مجھے آواز دی۔ نجانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے میں آج سے برسوں پیچھے پہنچ گیا ہوں۔ میرا آٹھویں کا رزلٹ نکلا ہے۔ اور میں دوڑتا ہوا گھر کی طرف جا رہا ہوں کہ اچانک کوئی آواز دے کر مجھے روکتا ہے۔ ایک خوف نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کیا آج کوئی اور بری خبر میری منتظر تھی۔

میں نے مڑ کر دیکھا وہ ہمارے محلے کا ایک لڑکا تھا۔

"اکبر تمہارے والد کی طبیعت بہت بگڑ گئی ہے۔ جلدی گھر چلو۔" "کک، کیا ہوا؟" میں نے اس سے پوچھا پھر اس کی بات سنے بغیر ہی گھر کی طرف دوڑ پڑا۔

ابو چارپائی پر بے سدھ پڑے تھے۔ امی ان کے قریب ہی بیٹھی تھیں۔ "کیا ہوا ابو کو؟" میں نے ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھا جو بری طرح تپ رہا تھا۔ پھر امی کی طرف مڑا۔

"بخار ہیں۔" امی نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔ میں کچھ سمجھ نہ پایا۔ "مم میں ابھی گاڑی لے کر آتا ہوں ہسپتال جانا پڑے گا۔ میں

دروازے کی طرف مڑا۔

"رہنے دو۔ گھر میں ایک پیسہ نہیں ہے۔ نہ ٹیکسی کے کرائے کے لئے اور نہ علاج کی فیس کے لئے۔"

"مگر کل ہی تو ابو نے مجھے تین ہزار روپے دئے تھے؟"

وہ روپے تیری پڑھائی کے لئے نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے علاج کے لئے ادھار لئے تھے۔" "کیا؟" میں چیخ پڑا۔

ابھی کچھ کہنے اور سوچنے کا وقت نہ تھا میں دوڑتا ہوا گاڑی لایا اور ہسپتال روانہ ہو گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ڈاکٹر نے آکر بتایا کہ ان کی طبیعت اب خطرے سے باہر ہے۔ لیکن وہ ابھی ہسپتال میں ہی رہیں گے۔

اس ایک گھنٹے میں میرے ذہن میں بچپن سے لے کر آج تک کے تمام واقعات دوڑ گئے۔ میں نے ہر جگہ اپنے آپ کو ہی قصور وار پایا۔ میرے والدین نے ہر دفعہ اپنی خوشیاں چھوڑ کر میری ضرورتوں کا خیال رکھا۔ مگر مجھے یہ احساس نہ ہو سکا کہ ان کو بھی میری ضرورت ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو بیٹا؟" امی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو میں چونک پڑا۔

"کچھ نہیں امی۔ بس سوچ رہا ہوں کہ صبح دکان کھولوں گا تو اس کی صفائی بھی کرنی پڑے گی۔ اور کچھ سامان بھی نیا لانا پڑے گا۔ اپنی کتابیں بھی ساتھ ہی لے جاؤں گا۔ وہیں بیٹھ کر پڑھوں گا۔"

۴ کا ہندسہ

(نادرہ اسلم۔ لاہور

○ ــ لفظ "اللہ" کے حروف کی تعداد چار ہے۔

ا، ل، ل، ہ

○ ــ لفظ "محمد" کے حروف کی تعداد چار ہے۔

م، ح، م، د

○ ــ "حضور اکرمؐ" کی بیٹیوں کی تعداد چار ہے۔

حضرت ام کلثومؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت زینبؓ، حضرت فاطمہؓ۔

○ ــ "آسمانی کتب" کی تعداد چار ہے۔

توریت، زبور، انجیل، قرآن مجید

○ ــ "مشہور ملائیک" کی تعداد چار ہے۔

جبرائیلؑ، میکائیلؑ، اسرافیلؑ، عزرائیلؑ۔

○ ــ "خلفائے راشدین" کی تعداد چار ہے۔

حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ

○ ــ "انسان کے دشمن" کی تعداد چار ہے۔

حسد، جھوٹ، غیبت، چغلی

○ ــ "پاکستان کی صوبوں" کی تعداد چار ہے۔

پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان۔

○ ــ "اطاعتوں" کی تعداد چار ہے۔

خدا کی اطاعت، رسولؐ کی اطاعت، والدین کی اطاعت، اُستاد کی اطاعت

مزید محنت کی ضرورت ہے

ناقابل اشاعت تحریریں ضائع کر دی جاتی ہیں اس لئے واپسی کا مطالبہ نہ کریں۔ کوئی بھی تحریر بھیجتے وقت اس کی ایک نقل اپنے پاس ضرور رکھیں۔ (ادارہ)

"عہد" ارشد محمود، آزاد کشمیر، "بے جا ضد" فرزانہ واحد بخش، سکھر، "میرے دوست" "کرکٹ" عبد السمیع، کراچی۔ "شرارت" تانیہ اعوان، ڈیرہ اسماعیل خان۔ "قصہ چہار درویش" "ممتاز الحق انصاری، کراچی۔ "امام اعظمؒ کی ذہانت" محمد حسنین، ڈیرہ اسماعیل خان۔ "دوستی اور چوری" سلمان خان یوسف زئی، حیدر آباد۔ "نور الدین زنگی" وسیم شہزاد، علی پور چٹھہ "گمراہ" سید صفدر رضا رضوی، کراچی۔ "اُنی زندگی" شہریار گل، ارمڑ پایان۔ "ممتا اور انصاف" لیاقت علی (؟) "کہانی" سید محمد احمد راشد، حیدر آباد۔ "ہماری شرارتیں" "کام" عمران داؤد، کراچی۔ "انوکھی سزا" محمد رشید احمد، خانیوال۔ "حکایات سعدی" "قصور کس کا" محمد آصف مغل، تونسہ شریف۔ "چاند بھائی" عفیفہ ابرہیم، کراچی۔ "آزاد کشمیر آزاد کرونی" حنا حنیف (؟) "وفاداری" "مقدس قاتل" محمد صفدر، ملتان۔ "تین سوال" متین بیتا، مکران "ہم بنے ادیب" محمد خالد آرائیں، نواب شاہ۔ "شرارت ہی شرارت" "بے زبان جانوروں پر رحم" محمد انور خان، عمر خیل۔ "احساس جرم" محمد انور راجپوت، ٹھٹھہ۔ "اف اللہ! یہ مہمان" نادرہ اسلم، لاہور کینٹ۔ "شرارتی خرگوش" عمران یونس، آزاد کشمیر۔ "آپریشن کچن" شہباز اکبر الفت، لاہور، "آخری شرارت" محمد ظہیر الدین، اٹک۔ "شرارت" راجہ محمود، حیدر آباد۔ "شرارت سے توبہ" نائلہ بختیار، کوہاٹ، "رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو" نادیہ مجید، کراچی۔ "بابر کی جانبداری" ذیشان احمد، خوشاب۔ "تاریخ کے دریچے سے" میجر نعیم الدین خالد، کوئٹہ۔ "اقبال و قائد" فاطمہ بشیر خانیوال "کشمیری مجلد کے نام" وقاص احمد بخش، راولپنڈی۔ "اوٹ پٹانگ" علی فرہاد حمید، لاہور۔ "لومڑی کا فریب" محمد انور خان، کوٹ گلان۔ "ذرا سی شرارت" محمد عمر قریشی، اسلام آباد۔ "شرارت سے توبہ" تاج محمد زہری، پسنی۔ "بلی کی شرارت" مہر اعجاز، لاہور۔ "منگی شرارت" خلیل جبار، حیدر آباد۔ "تکیہ فائٹ" کامران، سیالکوٹ "مہمان بلائے جان" فتح محمد عرشی (؟) "شرارت سید عدیل حیدر شاہ، خوشاب "نامی کی شرارت" صائمہ دلدار، جھمرہ سٹی۔ "شرارتی بچے" نوید مرزا، کراچی۔ "شہد کا چھتہ اور آگ" "ایڈیسن کی دلچسپ شرارتیں" عبد الستار خان طاہر، بورے والہ۔ "شریر کون" انور آس، کراچی۔ "شانی کی شرارت" صائمہ دلدار، جھمرہ سٹی۔ "میری شرارت" عمران شمس الدین (؟) "شرارت سے توبہ" نازیہ غوری، کراچی۔ "ٹیلی وژن" محمد خالد عمرو بن قریشی، نصر پور۔

"محنت کا پھل" مظہر عباس، کملیہ۔ "سال کے بارہ مہینے" جمشید احمد خان انصاری کراچی۔ "برین آف برٹین" "حیرت انگیز" شہر بانو بخاری، رحیم یار خان۔ "کرکٹ کا بھوت" محمد خالد حمیر، ملتان۔ "غرور کی سزا" محمد اشفاق کامران، بھکر۔

صفائی

زاہد الحسن زاہد

صفائی مسلماں کا ایمان ہے — جو رکھے صفائی وہ انسان ہے
صفائی کو رکھتا ہے جو بھی عزیز — سمجھتے ہیں اس کو سبھی باتمیز
صفائی سے ملتی ہے عزت بہت — محبت بہت اور مسرت بہت
صفائی سے ہوتی ہے حاصل خوشی — صفائی سے ہے چست ہر آدمی
صفائی کو کرتا ہے جو بھی پسند — سمجھتے ہیں اس کو سبھی عقلمند
صفائی سے صحت ہے، صحت سے جان — صفائی سے دو چند ہوتی ہے شان

بزرگوں کا زاہد یہ فرمان ہے
صفائی ہے کیا، نصف ایمان ہے

بچاؤ

پندرھویں قسط

اشتیاق احمد

انسپکٹر جمشید کی غیر حاضری میں بچے گھر پر اکیلے تھے کہ پروفیسر عمران جاہ زخمی حالت میں گھر میں داخل ہوئے۔ دشمن بھی ان کے تعاقب میں یہاں آن پہنچا۔ ایک طویل ذہنی اور جسمانی جنگ کے بعد بالآخر دشمن کو قابو کر لیا گیا۔ انسپکٹر جمشید واپس گھر پہنچے تو میدان صاف ہو چکا تھا۔ تمام حالات معلوم کرنے کے بعد وہ فوج کی مدد سے اپنے ساتھیوں سمیت شہر کی محفوظ ترین عمارت میں منتقل ہو گئے۔ انشارجہ کا زلزلہ بہت چالاک تھا۔ وہ پے در پے چالیں بدل کر عمارت کے اندر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس وقت وہ انسپکٹر جمشید کے میک اپ میں تھا۔ لیکن بظاہر معصوم نظر آنے والے بچے اس کے لئے لوہے کا چنا ثابت ہوئے اور وہ پیکٹ حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ بالآخر صدر صاحب کے انشارجہ سے واپس آنے پر پیکٹ ان کے حوالے کر دیا گیا۔ پیکٹ وصول کرنے کے بعد صدر صاحب کی اصلیت کھلی تو پتا چلا کہ وہ دراصل رابل ہے جو صدر کے میک اپ میں عمارت کے اندر داخل ہو کر وہ پیکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ لیکن بازی نے ایک بار پھر پلٹا کھایا۔ میدان دوبارہ انسپکٹر جمشید کے ہاتھ رہا۔ کیونکہ وہ شروع سے ہی پروفیسر عمران جاہ کے میک اپ میں عمارت کے اندر رہ کر دماغی چالیں چل رہے تھے۔

(اب آپ آگے پڑھیے)

اس کے ساتھ کمانڈر صاحب کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیل گئیں..... اس کا مطلب یہ تھا کہ انسپکٹر جمشید تو اکرام کی تلاش میں عمارت سے باہر گئے ہی نہیں تھے..... وہ عمارت میں ہی رہے تھے ..... ان کی جگہ محمد حسین آزاد انسپکٹر کے میک اپ میں گیا تھا۔

"یہ سب میرے لئے حد درجے حیرت انگیز ہے!" رابل نے کہا۔

"اور ..... اور میرے لئے بھی۔" کمانڈر صاحب بولے۔

"آخر کیوں..... اگر آپ میرے میک اپ میں یہاں آسکتے ہیں تو میرے میک اپ میں کوئی اور یہاں سے باہر کیوں نہیں جاسکتا تھا؟" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"لیکن آپ نے یہ اندازہ کس طرح لگالیا تھا کہ میں یہ چال چلوں گا؟"

"مجھے یہ بات قطعاً معلوم نہیں تھی کہ آپ یہ چال چلیں گے یا کیا چال چلیں گے..... لیکن میں اپنے پروگرام پر آخر وقت تک عمل کرتا رہا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ میرا پروگرام آپ کی ہر چال کا جواب بنتا چلا گیا..... بس میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنے دماغ سے ساتھ ساتھ کام لیا ہے..... جس وقت معلوم ہوا کہ اکرام سونا گھاٹ میں پھنس گیا ہے..... تو فوراً میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ اب مسٹر رابل چاہتے ہیں کہ میں اکرام کی تلاش میں نکلوں اور ان کا شکار ہو جاؤں..... لہٰذا میں نے سوچا..... مجھے رابل صاحب کے امیدوں پر پورا اترنا چاہئے..... لہٰذا میں نے یہاں محمد حسین آزاد کو بلوایا اس کے چہرے پر اپنا میک اپ کیا..... اپنے چہرے پر پروفیسر عمران جاہ کا میک اپ کیا اور پروفیسر عمران جاہ پر محمد حسین آزاد کا..... تاکہ اگر رابل کسی طرح یہاں پہنچ بھی جائے تو بھی وہ پروفیسر عمران جاہ کو تو ہرگز نشانہ نہ بنا سکے....."

"لیکن جانے سے پہلے تو مجھے آپ سب کو نشانہ بنا کر جانا تھا؟"

"اس صورت میں بھی پروفیسر ضرور بچ جاتے۔"

"وہ کیسے"؟

"پروفیسر عمران جاہ اس وقت بلٹ پروف لباس میں ہیں..... جونہی انہیں گولی لگتی، یہ گرتے اور ساکت ہو جاتے۔ آپ خیال کرتے کہ سب کو ختم کر دیا، لیکن پروفیسر کو بچا کر ہم پھر بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے..... مر کر بھی..... کیونکہ پروفیسر پھر یہ ساری کہانی صدر کو سنا ہی دیتے اور صدر صاحب پوری دنیا کو۔ لہٰذا اس کیس میں شکست پھر بھی آپ کی تھی بلکہ شکست فاش، اور ہم مر کر بھی جیت جاتے۔"

"ابھی میرے ہاتھ میں ایک آخری تیر موجود ہے۔" رابل نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر کہا۔

"تو مہربانی فرما کر وہ بھی چلا لیں..... تاکہ ہم فارغ تو ہو جائیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"شکریہ! ضرور چلاؤں گا..... ابھی فون آیا ہی

چاہتا ہے۔" یہ کہتے وقت اس نے گھڑی دیکھی۔ عین اس وقت فون کی گھنٹی بجی.....

انسپکٹر جمشید نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھالیا۔

"انسپکٹر جمشید بات کر رہا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے..... بازی تمہارے ہاتھ رہی؟" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"کون بات کر رہا ہے؟"

"انٹارجہ سے کال ہے..... فون رابل کو دے سکتے ہیں؟"

"ا ضرور کیوں نہیں..... آپ اپنی ناکامی کی داستان ی سے سنیں گے تو زیادہ لطف آئے گا۔" پکٹر جمشید نے مسکراتے ہوئے کہا اور ریسیور رابل کی طرف بڑھا دیا۔

"مسٹر رابل آپ کی توقع کے عین مطابق یہ آپ کا ہی فون ہے..... اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ آخری تیر کون سا چلاتے ہیں۔"

"بس دیکھتے جائیں۔" اس نے خوش ہو کر کہا اور ریسیور لے لیا۔

"یس سر..... رابل اس طرف۔" اس نے کہا اور دوسری طرف کی بات سن کر بولا۔

"ہاں! اس میں شک نہیں..... انسپکٹر جمشید نے اپنے ذہن سے مجھے شکست دے دی ہے..... میں پروفیسر عمران جاہ کو بھی ہلاک نہیں کر سکا..... اور نہ دستاویز حاصل کر سکا۔"

اب وہ پھر دوسری طرف کی بات سننے لگا..... پھر اس نے ریسیور انسپکٹر جمشید کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اس کو کان سے لگاتے ہوئے بولے:

"جی فرمایئے..... کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"انسپکٹر جمشید! یہ نہ بھولیں..... آپ کے ملک کے صدر اس وقت بھی ہمارے قبضے میں ہیں..... ہم چاہیں تو ان کے ذریعے اعلان کرا سکتے ہیں کہ وہ ابھی پندرہ دن اور انشارجہ میں ٹھہریں گے اور انسپکٹر جمشید..... پندرہ دن برین واشنگ کے لئے کافی ہوتے ہیں..... ہم ان کا برین واش کرنے کے لئے دن رات ایک کر دیں گے..... لہٰذا پندرہ دن بعد جو صدر واپس ملک میں آئے گا..... وہ ہمارا آدمی بن کر آئے گا۔ اور جو ہم چاہیں گے وہ صرف وہ کرے گا..... اور آپ کی اطلاع کے لئے یہ بھی بتا دیں کہ جونہی ہمیں اطلاع ملی تھی کہ پروفیسر عمران جاہ کسی قسم کے کاغذات لے کر ملک سے فرار ہو رہے ہیں..... اسی وقت ہم نے خفیہ طور پر ایک اہم بات کرنے کے بہانے آپ کے ملک کے صدر کو بلایا تھا..... تاکہ کاغذات ان کے حوالے کئے ہی نہ جا سکیں۔ اور دیکھ لیں..... آپ لوگ اب تک کاغذات ان کے حوالے نہیں کر سکے۔"

"دیکھ لیا..... اب آپ کیا کہتے ہیں؟" انسپکٹر جمشید نے بُرا سا منہ بنایا۔

"آپ پوری طرح جیت کے بھی نہیں جیت سکے..... اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے صدر درست حالت میں یہاں پہنچ جائیں..... تو رابل کو

ان کاغذات سمیت ہماری طرف روانہ کر دیں...... اس میں کوئی چکر آپ نہیں چلا سکیں گے۔ رابل اصل کاغذات کو اچھی طرح پہچانتا ہے ...... ان کاغذات کی نہ تو فلم تیار کرائی جاسکتی ہے ...... نہ کسی طرح بھی نقل کی جاسکتی ہے ...... گویا اس کی دوسری کاپی بنانا ممکن ہی نہیں ...... وہ ایسے ہی کاغذات ہیں ...... اُدھر آپ رابل کو کاغذات دے کر ہماری طرف بھیجیں گے ......اِدھر ہم صدر صاحب کو بھیج دیں گے۔"

انسپکٹر جمشید سوچ میں ڈوب گئے ...... انہیں غصہ آنے لگا ...... آخر بولے۔

"میں چند منٹ بعد آپ کو جواب دے سکتا ہوں ...... اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے ...... ہم پندرہ منٹ بعد فون کریں گے۔"

انسپکٹر جمشید نے ریسیور رکھ کر ساری صورت حال انہیں بتائی اور بولے۔

"اب کیا کیا جائے؟"

"ہاہاہا ...... ابھی آپ کہہ رہے تھے ...... کہ مجھے شکست فاش دے دی ہے ...... اب آپ کا اپنی فتح کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"مسلمان فتح اور شکست سے بے نیاز ہو کر لڑتا ہے ...... کیونکہ اسے تو اجر اپنے اللہ سے لینا ہوتا ہے ...... نہ کہ دنیاوی فوائد حاصل کرنا ہوتے ہیں ...... لہٰذا آپ ذرا خاموش رہیں اور مجھے مشورہ کرنے دیں۔"

"ضرور کریں۔" اس نے طنزیہ کہا۔

وہ سوچ میں ڈوب گئے ...... چند منٹ تک سب سوچتے رہے پھر انسپکٹر جمشید بولے۔

"پروفیسر عمران جاہ ...... یہ کیس دراصل آپ کا کیس ہے ...... لہٰذا سب سے پہلے آپ بتائیں ہم کیا کریں؟"

"ہم صرف رابل کو واپس دے سکتے ہیں ...... کاغذات کو نہیں ...... اگر یہ ہم نے واپس کر دیئے ...... تو کوئی ہماری بات پر یقین نہیں کرے گا۔"

غلطی ہے

○ اس نیت سے عیب کرنا کہ دو چار مرتبہ کر کے چھوڑ دوں گا۔

○ ہر ایک انسان کا متعلق ظاہری صورت دیکھ کر رائے قائم کرنا۔

○ اپنے ماں باپ کی خدمت نہ کرنا اور اپنی اولاد سے اس کی توقع رکھنا۔

○ اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کرنا اور کسی خدائی عطیہ کا امیدوار رہنا۔

○ آزمائے ہوئے کو آزمانا۔

○ ہر ایک شریں زبان والے کو درست سمجھ لینا۔

○ ادائیگی قرض کے متعلق دلفریب ذرائع آمدنی کا تصور باندھ کر غیر ضروری اخراجات کے لئے بے دھڑک قرض لینا۔

مرسلہ:۔ انجم اقبال وڑائچ۔ گوجرانوالہ

"ہوں ..... کمانڈر صاحب ..... آپ کیا کہتے ہیں؟"

"پروفیسر عمران جاہ کی تجویز اگر انشارجہ والے نہیں مانتے تو ..... اس صورت میں ہم کیا کریں گے۔ کیا اپنے ملک کے صدر کو پھنسوا دیں گے؟"

"ہاں ہمارے لئے مشکلات ہی مشکلات ہیں ..... خیر مجھے سوچنے دیں ..... فرزانہ تم کچھ سوچ سکتی ہو؟"

"جی ہاں! ایک بات میرے ذہن میں آتو رہی ہے۔"

اور پھر فرزانہ نے اپنا منہ ان کے کان سے لگا دیا ..... وہ فرزانہ کی ترکیب سنتے چلے گئے اور ان کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں ..... آخر میں وہ بھرپور انداز میں مسکرا دیئے۔

"بہت خوب فرزانہ ..... تم تو کبھی کبھی میرے کان کاٹ جاتی ہو۔"

"نن ..... نہیں تو ابا جان۔" فرزانہ نے ان کے دونوں کان جلدی جلدی چھو کر دیکھے .....

ٹھیک پندرہ منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی ..... ادھر رابل کے چہرے پر شدید الجھن کے آثار تھے ..... اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ انسپکٹر جمشید فون پر کیا کہنے والے ہیں ....."

"کمانڈر صاحب ..... آپ مہربانی فرما کر رابل کے منہ پر ٹیپ چپکا دیں ..... میں فون دوسرے کمرے میں لے جاکر سنتا ہوں ..... تاکہ ذرا سی آواز بھی ریسیور تک نہ پہنچ سکے۔"

"آپ ..... آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟" وہ چلّایا۔

اور ساتھ ہی اس کا منہ بند کر دیا گیا ..... ریسیوں سے اسے پہلے ہی جکڑ دیا گیا تھا ..... اب منہ بھی بالکل بند ہو گیا ..... انسپکٹر جمشید دوسرے کمرے میں گئے۔ دروازہ بند کر کے انہوں نے ریسور اٹھا لیا۔

"ہمیں آپ کی شرط منظور ہے ..... ہم اپنے صدر کو بہت پسند کرتے ہیں ..... ان کی واپسی درست حالت میں چاہتے ہیں ....."

"بہت خوب! میرا بھی یہی خیال تھا کہ آپ لوگ اس پر مجبور ہو جائیں گے ..... اب پروگرام سُن لیں ..... اِدھر سے ہم آپ کے ملک کے صدر کو خصوصی طیارے میں بٹھائیں گے ..... آپ انشارجہ میں موجود اپنے جاسوسوں سے بے شک نگرانی کرالیں۔ وہ آپ کو سادی کارروائی کی اطلاع ساتھ ساتھ دیں گے ..... اُدھر ہمارے جاسوس سب کارروائی کی پل پل کی رپورٹ ہمیں دیں گے ..... رابل بھی یہاں سے رخصت ہونے سے پہلے ہمیں فون پر مطمئن کرے گا ..... واضح رہے کہ یہاں فون پر ہم اس کی تصویر دیکھیں گے۔ آپ تصویر والے سیٹ پر اس سے ہماری بات کرائیں گے ..... کاغذات اس کے ہاتھ میں ہوں گے ..... ان کاغذات کی تصویر بھی فون کے سیٹ پر ہی نظر آجائے گی ..... پھر ہمارے جاسوس جہاز تک برابر

اس پر نظر رکھیں گے۔"

"ٹھیک ہے..... ہر کام آپ کی ہدایات کے عین مطابق ہو گا۔"

"اور یہ بھی سن لیں..... آپ کے جہاز کو ٹھیک سولہ گھنٹے میں انشارجہ کے ایئرپورٹ کے اوپر پہنچنا ہے..... اتنے ہی وقت میں صدر کا طیارہ آپ کے ایئرپورٹ کے اوپر موجود ہو گا۔"

"ٹھیک ہے....." انہوں نے کہا۔

"تو پھر اب سے ٹھیک چار گھنٹے بعد اِدھر سے طیارہ اڑے گا..... ٹھیک چار گھنٹے بعد ہی طیارہ اُدھر سے اڑنا چاہئے..... ایک سیکنڈ کا فرق بھی نہ ہو مسٹر انسپکٹر جمشید۔" سرد آواز میں کہا گیا۔

"میں نے تمام باتیں نوٹ کر لی ہیں..... ہر کام آپ کی مرضی کے عین مطابق ہو گا۔"

انسپکٹر جمشید پہلے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے پاس چار گھنٹے تھے..... لہٰذا وہ اور ان کے ساتھی اپنے کام میں مصروف ہو گئے..... تمام تیاریاں جب مکمل ہو گئیں تو انشارجہ کو فون کیا گیا۔ اور اس مرتبہ رابل نے ان سے بات کی..... کاغذات بھی اس کے ہاتھ میں تھے..... ان کاغذات کو بھی باقاعدہ کھول کر دکھایا گیا.....

"مسٹر رابل..... آپ پوری طرح مطمئن ہیں..... یہ لوگ کوئی چال تو نہیں چلنا چاہتے؟"

"نہیں سر۔" اس نے کہا

"اپنا کوڈ دہراؤ۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"نائن نائن زیرو ون۔" وہ بولا

"بہت خوب! اب ہمارا اطمینان ہو گیا۔"

"جناب! آپ بھی تو ہمارا اطمینان کرائیں۔"

"ہاں ضرور..... کیوں نہیں..... لیجئے..... فون پر اپنے صدر سے بات کر لیں..... دیکھ بھی لیں؟

ساتھ ہی صدر صاحب اسکرین پر نظر آنے لگے..... ان سے کمانڈر انچیف بات کرنے کے لئے آگے بڑھے۔

"السلام علیکم سر..... یہ آپ ہی ہیں نا سر؟" وہ بولے۔

"ہاں یہ میں ہوں..... آخر کیا بات ہے..... میری واپسی اس پراسرار طریقے سے کیوں ہو رہی ہے؟"

بھینس

بھینس ایک بہت مفید جانور ہے پنجاب کے بیشتر علاقوں میں اسے "مج" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ قد میں عقل سے تھوڑی ہی بڑی ہوتی ہے۔ چوپائیوں میں یہ واحد جانور ہے جو موسیقی سے گہرا لگاؤ رکھتا ہے۔ اسی لئے لوگ اس کے آگے بین بجاتے ہیں۔ بھینس دودھ دیتی ہے لیکن یہ کافی نہیں ہوتا لہٰذا باقی دودھ گوالا دیتا ہے اور دونوں کے باہمی تعاون سے ہم شہریوں کا کام چلتا ہے۔ تعاون یوں تو بہت اچھی چیز ہے لیکن دودھ کو چھان لینا چاہئے تاکہ مینڈک نکل جائیں۔

(ابن انشا)

"جب آپ یہاں پہنچیں گے تو تفصیلات بتا دی جائیں گی۔"

"ہوں! اچھا..... اور کوئی بات؟"

"آپ نے وہ کام تو کر لیا نا سر؟"

"اوہ نہیں..... میں بھول گیا تھا..... خیر اب کروں گا..... آپ فکر نہ کریں۔"

"اور پھر ریسیور رکھ دیا گیا..... واپسی کی تیاری شروع ہونے لگی..... آخر ٹھیک وقت پر رابل کا طیارہ ایئرپورٹ سے اڑا..... انشارجہ کے جاسوسوں نے اس سارے منظر کی تفصیلات فوری طور پر انشارجہ کو دیں۔ ادھر سے صدر صاحب کا طیارہ اڑا اور ان کے جاسوسوں نے پل پل کی خبریں ادھر سے انہیں دیں.....

"اب سولہ گھنٹے تک ہماری چھٹی۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"ویسے فرزانہ..... تمہاری ترکیب کو بھی ماننا پڑتا ہے..... ان حالات میں اس سے اچھی ترکیب کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی....."

"شکریہ..... بہت بہت۔"

اور پھر سولہ گھنٹے بعد وہ ایئرپورٹ پر موجود تھے..... انہوں نے طیارے کو ایئرپورٹ پر اڑتے دیکھا..... جونہی طیارہ رن وے پر اترا..... وہ آگے بڑھے..... وہ سب اپنے صدر سے ملنے کے لئے بُری طرح بے چین تھے اور یہی حال صدر صاحب کا تھا۔

(پھر کیا ہوا؟ آئندہ شمارہ میں ملاحظہ کیجئے)

بچوں کے مشہور و معروف مصنف

اشتیاق احمد

کے سنسنی خیز، ہنگامہ آرا، مزاح اور جاسوسی سے بھرپور ناول

۵۷۰ — صرف ایک گولی — انسپکٹر جمشید سیریز — ۱۰ روپے
۵۷۱ — فائل ۱۱۹ — " — ۱۰ "
۵۷۲ — شیطانی طاقت — " — ۱۰ "
۵۷۳ — چالاک — " — ۱۰ "
۳۹ — کالا طوفان — " — ۱۰ "
۴۰ — اندھی قید — " — ۱۰ "
۱۵ — آدھا چہرہ — انسپکٹر کامران مرزا سیریز — ۱۰ "
۱۶ — خفیہ کمرہ — شوکی سیریز — ۱۰ "

۲۰ اپریل ۱۹۹۴ء

کو آپ کے شہر میں ہر بڑے بکسٹال پر دستیاب

یا

پھر براہِ راست خط لکھ کر ادارے سے بذریعہ وی پی منگوائیں

اشتیاق پبلی کیشنز

۹/۱۲ نصیر آباد، مسلم پورہ، سانده کلاں

لاہور، — فون ۷۲۴۶۳۵۶

دنیا تھوڑی ہے

ممتاز الدین احمد

حضرت عبداللہ حنیف رحمتہ اللہ سے کسی نے آ کر کہا کہ حضور! شہر میں ایک بوڑھا مراقبے میں بیٹھا ہے جو اپنا سر اٹھاتا ہی نہیں۔ حضرت عبداللہؒ کو شوق پیدا ہوا اور وہاں پہنچے۔ انہوں نے بوڑھے کو دیکھا جو قبلہ کی طرف منہ کئے مراقبے میں تھا۔ حضرت عبداللہؒ نے سلام کیا۔ اس نے جواب نہ دیا۔ انہوں نے پھر سلام کیا۔ اس نے پھر جواب نہ دیا۔ انہوں نے تیسری مرتبہ سلام کیا اور کہا "تمہیں خدا کی قسم کہ میرے سلام کا جواب دو"۔ بوڑھے نے سر اٹھایا اور کہا۔

"اے عبداللہ دنیا تھوڑی ہے اور تھوڑی سے تھوڑی ہی باقی رہ گئی ہے اس تھوڑی سے تم حصہ بڑا حاصل کرنے کی کوشش کرو لیکن شاید تم بے فکر ہو کہ اتنی دور سے میرے سلام کو یہاں آئے۔"

یہ کہہ کر پھر سر جھکا لیا۔ حضرت عبداللہؒ نے وہیں اس کے پاس ظہر اور عصر کی نماز ادا کی اور پھر عرض کی کہ "مجھے کچھ نصیحت کیجئے"۔ بوڑھے نے کہا۔

"ایسے شخص کی صحبت اختیار کرو جس کا دیدار تجھے خدا کی یاد دلا دے اور حق تعالیٰ کی شوکت دل میں پیدا کر دے۔"

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

سیرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چیدہ چیدہ واقعات

ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سادہ مزاج تھے۔ اللہ نے آپ کے ہاتھ میں سارے عرب کی حکومت دی تھی لیکن آپ میں ذرّہ بھر غرور اور گھمنڈ نہ تھا۔ گھر کا کام کاج خود ہی کر لیتے، اپنے کپڑوں پر پیوند لگا لیتے، اپنا جوتا گانٹھ لیتے، گھر میں جھاڑو لگا لیتے، خود ہی بکری کا دودھ دھو لیتے اور زمین پر، چٹائی پر، فرش پر جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے تھے۔ مجلس میں کبھی پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے۔ چھوٹا ہو یا بڑا اسے سلام کرنے میں پہل کرتے، غریبوں اور غلاموں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیتے۔ صحابہؓ کے ساتھ گھل مل جاتے۔ ان سے الگ اور اونچی جگہ پر بیٹھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مجلس میں کوئی اجنبی شخص آپ کو آسانی سے پہچان ہی نہیں سکتا تھا۔ بازار سے خود سودا خرید کر لے آتے اور اپنے جانوروں کو خود چارہ ڈالتے تھے۔

ایک دن آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے نکلے۔ لوگ آپؐ کو دیکھ کر ادب سے کھڑے ہو گئے۔ آپؐ نے ان کو منع فرمایا کہ "میرے آنے پر کھڑے مت ہوا کرو۔"

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول پاکؐ حج کے لئے گئے تو میں نے دیکھا جو چادر آپؐ نے اوڑھ رکھی تھی اس کی قیمت صرف چار درہم سے زیادہ نہ تھی۔

ایک دن آپؐ نے ایک دکان سے پاجامہ خریدا۔ اٹھنے لگے تو دکاندار نے آپ کا ہاتھ چومنا چاہا۔ آپؐ نے ہاتھ پیچھے ہٹالیا۔ فرمایا "یہ تو عجم کے لوگوں کا طریقہ ہے۔ میں بادشاہ نہیں ہوں تم ہی میں سے ایک ہوں۔"

جس دن رسول پاکؐ کے بیٹے حضرت ابراہیمؓ نے وفات پائی۔ اتفاق سے اس دن سورج گرہن تھا۔ لوگوں نے خیال کیا کہ آپ کے صدمہ کا اثر سورج پر بھی ہوا ہے آپؐ نے سنا تو لوگوں کو مسجد میں جمع کیا اور فرمایا "لوگو! کسی کی موت سے سورج یا چاند گرھن نہیں لگتا۔ یہ اللہ کی قدرت کی ایک نشانی ہے۔"

ایک دفعہ ایک صحابی نے باتیں کرتے کرتے کہہ دیا "جو اللہ چاہے.... اور آپؐ چاہیں" آپؐ نے فرمایا "تم نے مجھے خدا کا شریک بنا دیا۔ یوں کہو جو اللہ تعالیٰ (اکیلا) چاہے۔"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول پاکؐ سے ہم نے سنا۔ آپؐ فرماتے تھے کہ "لوگو! میری حد سے زیادہ تعریف نہ کرنا جس طرح عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حد سے زیادہ تعریف کرتے ہیں (ان کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں) میں تو اللہ کا بندہ ہوں۔ اس لئے تم مجھ کو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔"

بدر کی لڑائی میں تین سو تیرہ مسلمانوں کے مقابلے میں ایک ہزار کافر تھے۔ جب لڑائی شروع ہوئی تو رسول پاکؐ دشمن کی صفوں کے سب سے زیادہ قریب تھے۔ یہ اتنی خطرناک جگہ تھی کہ آپؐ کا قریب کھڑے ہونا بھی بڑی بہادری اور دلیری کا کام تھا۔

ہمیں چاہئے کہ ہم اللہ کے پیارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلیں اور ان واقعات سے روشنی حاصل کریں۔

جب دل اندھے ہو جائیں

کتنی ہی خطا کار بستیاں ہیں جن کو ہم نے تباہ کیا اور آج وہ اپنی چھتوں پر اُلٹی پڑی ہیں۔ کتنے ہی کنوئیں بیکار اور کتنے ہی محل کھنڈر بنے ہوئے ہیں۔ کیا یہ لوگ زمین پر چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے اور ان کے کان سُننے والے ہوتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

(سورۃ الحج، ۴۵۔۴۶)

مرسلہ..... محمد سلیم امام، العین۔

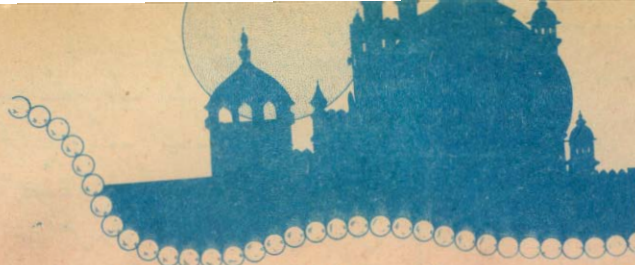

کرنیں

رفیع انصاری، کراچی

عید کی چاند رات تھی۔ گھر گھر عید کی
یاں ہو رہی تھیں کہ امیر المومنین حضرت عمر بن
لعزیزؒ کا معصوم بچہ دوڑتا ہوا گھر میں آیا اور اپنی
سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ماں
اپنے لختِ جگر کو اس طرح روتے ہوئے دیکھا تو
"پیارے بیٹے! آج کیوں رو رہے ہو آج تو
کا دن ہے کیونکہ کل عید ہے۔"

دوسرے دن دمشق کے بازار میں بڑی
تھی۔ سب لوگ عمدہ لباس زیب تن کئے
ئے تھے۔ خلیفتہ المسلمین حاکمِ وقت حضرت
ن عبدالعزیزؒ تاجدار دولت عالیہ بھی اپنے بچّے
ساتھ عید گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ آپؒ
ن کے بچّے نے نئے کپڑے تو نہیں پہنے تھے
چہرے روحانی مسرّت سے منوّر تھے۔ کیونکہ
کو امیر المومنین نے اپنے بچّے کو سمجھایا تھا کہ جو
دنیا میں پُرانے کپڑے پہنتے ہیں، اللہ تعالیٰ
جنّت میں نئے لباس پہنائے گا۔ اور جنّت کی
دائمی ہوتی ہے اس کو کوئی چھین نہیں سکے

نے جواب دیا۔ "امّی جان! کل عید کے دن
بچّے نئے کپڑے پہن کر عید گاہ جائیں گے
لیکن میں یہی کپڑے دھو کر پہنوں گا۔" ماں نے
اپنے بیٹے کو تسلّی دی کہ اپنے ابّا جان کو آنے دو میں
نئے کپڑے بنوا دوں گی۔ بچّہ یہ سُن کر خوش ہو
گیا۔ تھوڑی دیر بعد امیر المومنین امورِ سلطنت سے
فارغ ہو کر گھر آئے تو رفیقۂ حیات نے بیٹے کی
آرزو بیان کی۔ امیر المومنین نے ساری بات سن
کر جواب دیا "فاطمہؓ! تمہیں کیا معلوم ہے میں دو
درہم روزانہ کا مزدور ہوں۔ نئے کپڑے کہاں
سے بنوا سکتا ہوں؟" فاطمہؓ کے بے حد اصرار پر
بیت المال کے وزیرِ خزانہ کو خط لکھا کہ میرا ایک ماہ کا
حق خلافت (وظیفہ) پیشگی بھیج دیجئے۔ تھوڑی
دیر بعد غلام وزیرِ خزانہ کا جوابی خط لے کر آیا۔
اس خط میں لکھا تھا "یا امیر المومنین! میں آپ کے
ارشاد کی تعمیل کو حاضر ہوں لیکن امیر المومنین کو یہ
کیونکر یقین ہوا کہ وہ ایک مہینے تک زندہ رہ سکتے ہیں
اور جب یہ یقین نہیں کیا جا سکتا تو پھر غریبوں کے
مال کا حق کیوں پیشگی اپنی گردن پر رکھتے ہیں؟"
امیر المومنین نے خط پڑھا تو بھرائی ہوئی آواز میں گویا
ہوئے "واللہ! بیت المال کے وزیر نے مجھے ہلاکت
سے بچا لیا۔"

کیسی رہی

آخری حصہ

اے اے حسن

کرفیو کی وجہ سے ہمارا کزن عمر ہمارے گھر رہنے آ گیا۔ تو ہم اسکول سے چھٹی کا کوئی بہانہ ڈھونڈنے لگے۔ بہانہ مل گ
کزن کو لے کر باہر کھیلنے کودنے نکل گئے۔ شکیل عرف ولن نے ہماری پٹائی لگادی۔ اس سے بدلہ لینے کا بھوت ہم پر سوار
گیا۔ ہم نے اپنے کزن کو بدلہ لینے کی ترکیب بتائی تو وہ اچھل پڑے۔ "کیا تم نے شکیل کو قتل کر دیا؟؟" عمر کے لہجے
سخت حیرت تھی..... !! (اب آپ آگے پڑھیے)

(اسے ہم پر کتنا احمقانہ شبہ ہوا تھا)

"پاگل آدمی کبھی سوچ سمجھ کر بھی بول لیا کرو۔ ہم نے ایک خواب دیکھا ہے۔"

"چلئے! آپ خواب بتایئے۔" عمر نے
بناتے ہوئے کہا۔ "بھئی! میں نے خواب میں د
ہے کہ ہم پولیس کو شکیل بن کر فون کر رہے

اور جھوٹ موٹ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے گھر ڈاکو آگئے ہیں پلیز، ہماری مدد کو آیئے! تو کیوں نا ہم سچ مچ شکیل بن کر پولیس کو جھوٹ موٹ فون کریں اور شکیل کے گھر کا پتہ بھی بتا دیں تاکہ پولیس اس ..... خبر غلط ہونے پر شکیل کی خوب خبر لے سکے۔" ہم نے اپنی چوٹیں سہلاتے ہوئے اپنے کزن سے کہا تو وہ گھبرا کر بولا۔

"اگر پکڑے گئے تو؟" "نہیں پکڑے جائیں گے ....." اب مجھے شرارت سوجھنے لگی تھی چنانچہ میں نے پولیس اسٹیشن کا فون نمبر ملایا۔ "ہیلو! پولیس اسٹیشن؟" "نہ تو تمہارا کیا خیال ہے یہ ریلوے اسٹیشن ہے؟" دوسری طرف سے کرخت لہجے میں جواب ملا۔ میں نے گھبرائی ہوئی آواز بنا کر کہا۔ "دیکھیں جناب! میرا نام شکیل ہے ....." "تو میرا کیا قصور ہے؟" بات کاٹ دی گئی۔ "جناب! بس یہ کہہ رہا ہوں کہ میرا نام شکیل ہے اور میں چھپ کر آپ کو فون کر رہا ہوں ....." "تمہیں کس احمق نے کہا ہے کہ چھپ کر فون کرو، بھائی منظر عام پہ آکر فون کرو۔ اخبار میں تصویر چھپوا کر فون کرو، T.V پر اشتہار دے کر فون کرو مگر اس وقت نہ کرو ..... یہ ہمارے آرام کا وقت ہے۔" یہ کہہ کر فون کھٹ سے بند کر دیا گیا۔ "یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔" میں نے عمر کی طرف بے چارگی سے دیکھا۔ "تمہاری ایکٹنگ ہی اتنی غیر متاثر کن تھی کہ پولیس نے سننا گوارا نہیں کیا۔" خیر پھر کوشش کرو۔" عمر نے ایک شان بے نیازی سے ہماری ہمت بندھائی۔ اور ہم نے اسے گھورتے ہوئے پھر فون ملایا "ہیلو!" وہاں سے بے زار لہجے میں کہا گیا۔ میں نے آواز پہچان لی تھی اس لئے گھبرایا ہوا لہجہ بنا کر کہا۔ "جناب میری بات تو سنیں میں شکیل بول رہا ہوں (میں چاہتا تھا کہ انہیں نام یاد ہو جائے) آپ کو دوبارہ فون اس لئے کیا ہے کہ ہمارے گھر ڈاکو آگئے ہیں میں دوسرے کمرے میں ہوں پلیز آپ جلدی سے آجائیں۔ اس بار میں نے انہیں بولنے کا موقع دیئے بغیر تیزی سے بات مکمل کر دی۔ "تو بھائی انہیں میرا نام بتا دو دُم دبا کر بھاگ جائیں گے۔ میرا نام چنگیز خان ہے۔" وہاں سے ڈینگ ماری گئی۔ اور میں تلملا کر رہ گیا۔ "جناب ان کے پاس اسلحہ ہے اور وہ سارا قیمتی سامان سمیٹ رہے ہیں۔"

"اچھا! تو ایسا کرو اس سے پستول چھین لو اور ایک کی ٹانگ میں گولی مارو اور دوسرے کی ران پر۔ پھر انہیں لات مار کر باہر نکال دو۔ ختم۔" وہاں سے نسخہ بتایا گیا۔ اب میں غصہ میں آگیا لیکن آرام سے کہا۔ "دیکھیں آپ جلدی سے آجائیں ورنہ وہ بھاگ جائیں گے۔" "او ہو! ایک تو تم لوگ بہت بزدل ہوتے ہو۔ ہر کام میں پولیس کی مدد چاہئے خود بھی کچھ کر لیا کرو۔ خیر اپنا پتہ بتاؤ۔" یہ سنتے ہی میں جلدی جلدی شکیل کے گھر کا پتہ بتانے لگا۔ "دیکھو! اگر جھوٹ بولا ناں! تو تمہاری چمڑی ادھیڑ دوں گا۔" غصے میں کہا گیا اور

پھر کھٹ سے فون بند ہو گیا۔ "مجھے تو ان کے آنے کے بالکل امکانات نظر نہیں آتے۔" عمر نے خدشہ ظاہر کیا "دیکھو! کیا ہوتا ہے!!" میں نے کندھے اچکائے۔ پھر ہم چھت پر جاکر کھڑے ہو گئے اور شکیل کے گھر کی طرف دیکھنے لگے جو گلی کے آخر میں تھا۔ کچھ ہی دیر بعد کچھ مہمان آگئے تو امی نے ہمیں مختلف کاموں پر لگا دیا۔ اس طرح مہمانوں کی خاطر و مدارات کے دوران کافی وقت بیت گیا۔ ہم باہر نہیں جاسکے رات ہوئی تو ہم فون والے واقعے کو بھول کر سو گئے۔ خواب میں دیکھا کہ انسپکٹر چنگیز خان شکیل کی چمڑی ادھیڑ رہا ہے اور شکیل بھیانک آواز میں چیخ رہا، چلّا رہا ہے۔

صبح ناشتے پر امی نے ابو سے کہا "کچھ پتہ ہے کل شام خلیل صاحب کے ہاں کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟" ابو نے اخبار سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"کل ان کے لڑکے شکیل کو پولیس پکڑ کر لے گئی تھی تھانے۔ پھر کچھ دیر بعد چھوڑ دیا تھوڑی سی پٹائی کے بعد۔ انسپکٹر چنگیز جو اسے پکڑ کر لے گیا کہتا ہے کہ شکیل نے جھوٹ موٹ پولیس کو فون کیا تھا کہ ہمارے گھر ڈاکو آگئے ہیں پولیس وہاں پہنچی تو کوئی ڈاکو واکو نہ تھے جب کہ شکیل کہتا ہے کہ فون اس نے نہیں کیا۔"

"پھر کس نے کیا؟ شائد کسی نے شرارت کی اس کے ساتھ۔" "ہاں! لگتا تو یہی ہے کہ اس کے کسی دوست وغیرہ نے شرارت کی۔ ...... بہر حال ایسی شرارت جس نے بھی کی اسے نہیں کرنی چاہئے تھی۔" ابو پھر اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گئے تو عمر نے ہمیں کہنی مار کر باہر چلنے کا اشارہ کیا اور باہر آکر بڑی مشکل سے ضبط کی ہوئی ہنسی کو ہم مارکیٹ میں لانے کے قابل ہوئے۔ "کیسی رہی؟" ہم نے ہاتھ پھیلایا تو عمر نے ہمارے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"زبردست!" ...... لیکن بھئی! آپ نہیں کیجئے گا ایسی شرارت!!

مستقبل میں کون کیا ہو گا؟

ساجد الرحمٰن
کراچی

مستقبل کا جاوید میانداد...... باسط علی ...... ہو گا۔
مستقبل کا عمران خان ...... وسیم اکرم ہو گا۔
مستقبل کا بریڈمین ...... جاوید میانداد ہو گا۔
مستقبل کا عبدالقادر ...... مشتاق احمد ہو گا۔
مستقبل کا ویون رچرڈ ...... ڈین جونز ہو گا۔
مستقبل کا ایلن بارڈر ...... سعید انور ہو گا۔
مستقبل کا گواسکر ...... سنجے منجریکر ہو گا۔
مستقبل کا گریج ...... ڈیوڈبون ہو گا۔
مستقبل کا ہیڈلی ...... بشپ ہو گا۔

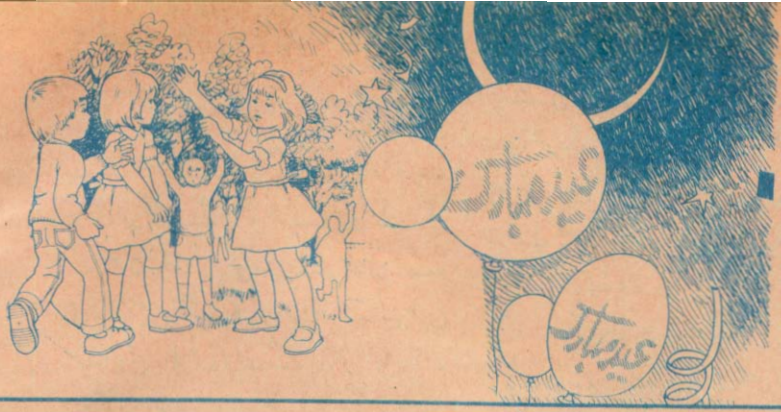

پھر عید آئی

مرسلہ: صلاح الدین ایوبی، لاہور

پیڑوں کے پیچھے بادل کے نیچے
پھر عید آئی پھر عید آئی

ماموں سے مجھ کو عیدی ملی ہے
میری شگفتہ دل کی کلی ہے
میری گلی میں میلہ لگا ہے
یہ سب سے اچھی میری گلی ہے
پیڑوں کے پیچھے بادل کے نیچے
پھر عید آئی پھر عید آئی

سب کی بھرے ہیں جیبوں میں پیسے
پہنے ہیں سب نے کیا صاف کپڑے
سکھیوں کے دیکھو ہاتھوں میں گجرے
باغوں میں ہم سب دیکھیں گے میلے
پیڑوں کے پیچھے بادل کے نیچے
پھر عید آئی پھر عید آئی

گھر سے چلیں گے کھا کر سوّیاں
بوتل پئیں گے کھا کر سوّیاں
سب سے ملیں گے کھا کر سوّیاں
میلے چلیں گے کھا کر سوّیاں
پیڑوں کے پیچھے بادل کے نیچے
پھر عید آئی پھر عید آئی

انعامی کہانی

بلا عنوان

محمد یاسر اعوان، کراچی

تین بہترین عنوان منتخب کرنے والے ساتھیوں کو تین ماہ کے لئے آنکھ مچولی کا تازہ شمارہ مفت ارسال کیا جائے گا

دانیال ایک نیک اور شریف لڑکا تھا۔ وہ ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ وہ بے حد ذہین بھی تھا۔ ہر امتحان میں کوئی نہ کوئی نمایاں کامیابی حاصل کرتا۔ دانیال کو خوبصورت رنگ برنگی پھولوں کی شہزادیاں جی ہاں! تتلیاں بہت پسند تھیں۔ وہ خوبصورت باغ میں جاکر اکثر تتلیاں پکڑتا اور کتابوں کاپیوں میں قید کر لیتا اس طرح بے چاری تتلیاں کاپیوں میں مر کر محفوظ ہو جاتیں۔

جمعہ کی شام دانیال اپنے گھر کے پاس واقع اس خوبصورت پھولوں والے باغ میں پہنچا اور تتلیاں پکڑنے لگا۔ رنگ برنگی پھولوں پر اُڑتی، منڈلاتی، تتلیاں ..... دانیال کو ان کے پیچھے دوڑنے میں خوب مزا آرہا تھا۔

وہ ایک تتلی کے پیچھے لگ گیا۔ تتلی کبھی اس پودے پر بیٹھتی، کبھی اس پودے پر دانیال دوڑتے بھاگتے تھک گیا لیکن تتلی ہاتھ نہ آئی۔ شام گہری ہونے لگی تھی۔

تتلی کے تعاقب میں دانیال گیٹ کے پاس آگیا۔ لوگ واپس جارہے تھے۔ اچانک دانیال کی نگاہ باغ کے گیٹ کے پاس پڑے ہوئے نوٹ پر پڑی۔ اندھیرے میں وہ ہلکا سا نظر آرہا تھا۔

دانیال نے اُٹھا کر دیکھا تو وہ سو روپے کا نوٹ تھا۔ دانیال نوٹ پاکر بہت خوش ہوا۔

"آہا مزا آگیا سب سے پہلے تو میں آئسکریم کھاؤں گا۔"

دانیال خوشی خوشی نوٹ لیکر آئسکریم والے کی دُکان پر پہنچا اور دُکان دار سے کہا۔ "جناب پندرہ روپے والی آئسکریم دے دیجئے۔" دُکان دار نے آئسکریم دے دی اور جب دانیال سے نوٹ لیا تو غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے دانیال کا کان پکڑا اور غصّے سے کہا۔ "میاں! کسی اور کو بے وقوف بنانا۔" یہ کہہ کر اس نے جھٹ سے آئسکریم کا کپ دانیال کے ہاتھ سے چھینا اور دانیال کے چہرے پر نوٹ توڑ مروڑ کر پھینکتے ہوئے کہا "یہ لو اپنا جعلی نوٹ اور بھاگو یہاں سے ......"

اس بے عزّتی پر دانیال کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے جھک کر نوٹ اُٹھایا پھر اپنی آنکھوں کے سامنے پھیلا کر دیکھا۔ نوٹ بالکل اصلی لگ رہا تھا لیکن اس پر بڑا بڑا ایک جملہ لکھا تھا۔ "خوش آمدید!"

اور یہ وہ نوٹ تھا جو کچھ دن پہلے عید پر دکان دار بیچ رہے تھے۔ "آئی ایم سوری! مجھے غلط فہمی ہو گئی۔" بڑی شرمندگی سے دانیال نے دُکان دار سے کہا اور شرمندہ شرمندہ دُکان سے باہر نکل آیا۔ شائد تتلیاں پکڑنے کی سزا کچھ اس طرح ملی تھی ......!!!

مجھے یہ شعر پسند ہے

گاؤں میں محبت کی رسم ہے منظر
شہر میں ہمارے تو جُرم ہیں جلائی

مرسلہ ...... محمد سعید گلاب، کراچی۔

خدا رحم کرتا نہیں اس بشر پر
نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر

مرسلہ ...... سیدہ نورین کاظمی، کراچی۔

ایسی تاریکیاں آنکھوں میں بسی ہیں کہ فراز
رات تو رات ہے ہم دن میں جلاتے ہیں چراغ

مرسلہ ...... نشاط رینہ، ملتان۔

امیرِ شہر نے کاغذ کی کشتیاں دے کر
سمندروں کے سفر پر کیا روانہ ہمیں

مرسلہ ...... منصور احمد سومرو، گڈو منڈی۔

کھٹ مٹھے

شہلا صدیقی

ٹنڈو آدم

ایک دفعہ ایک سکھ پان والے کے پاس پان لینے گیا۔ پان والے نے ازراہِ مذاق اس سے کہا کہ تم سکھ لوگ بہت بیوقوف اور عقل سے پیدل ہوتے ہو۔ یہ سُن کر سکھ طیش میں آکر بولا "یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

پان والے نے کہا "اچھا میں تم سے ایک سوال کرتا ہوں اگر جواب دے دیا تو میں مان لوں گا کہ تم عقلمند ہو۔"

سکھ نے کہا۔ "پوچھو۔"

پان والے نے سوال کیا کہ "میرے تین بھائی ہیں ایک امریکہ میں ہے ایک لندن میں۔ تیسرا کہاں ہے؟"

بہت دیر تک سکھ سوچتا رہا جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ لاجواب ہو کر کہنے لگا "میں نے ہار مانی تم ہی بتاؤ تیسرا کہاں ہے؟"

پان والے نے کہا۔ "بیوقوف! تیسرا میں خود ہوں۔"

یہ سُن کر سکھ چپ چاپ وہاں سے چلا آیا اور واپس آکر اپنے سکھ دوستوں سے کہنے لگا۔ "تم لوگ بیوقوف اور عقل سے پیدل ہو۔"

یہ سُن کر اس کے دوست بہت غصہ ہوئے اور کہنے لگے۔ "یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

سکھ نے کہا "اچھا میں تم سے ایک سوال کرتا ہوں اگر جواب دے دیا تو مان جاؤں گا کہ تم عقلمند ہو۔"

دوستوں نے کہا "چلو پوچھو۔"

سکھ نے سوال کیا کہ میرے تین بھائی ہیں ایک امریکہ میں ہے دوسرا لندن میں ہے یہ بتاؤ تیسرا کہاں ہے؟"

یہ سن کر اس کے دوست سوچ میں پڑ گئے۔ بالآخر کافی دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "ہم ہار گئے چلو تم ہی بتادو تیسرا کہاں ہے؟"

یہ سُن کر سکھ نے کہا "بیوقوفو! تیسرا پان والا ہے۔"

معذرت

گذشتہ ماہ "کیسی رہی" کا پہلا حصہ کاپی میں غلط جڑ گیا جس کی وجہ سے کہانی کی شکل ہی بدل گئی۔ ادارہ اس غلطی پر اے اے حسن اور اپنے قارئین سے سخت معذرت خواہ ہے۔

یہ اپنی زمیں یہ اپنا وطن

شبیر احمد خان
کراچی

کروڑوں برس گزرے سورج کے گرد گرم گیسوں میں لپٹے سیارے گھومتے تھے۔ زمین بھی ان سیاروں میں سے ایک تھی۔ زمین پہلے کبھی گرم سورج کا حصہ تھی لیکن بعد میں یہ ٹوٹ کر سورج سے الگ ہو گئی اور مدار میں تیرنے لگی پھر ایک روز ایسا ہوا کہ زمین کی سطح پر بے شمار شہاب گرنے لگے جن سے زمین پر جابجا گڑھے پڑ گئے۔ ان میں سے ایک زمین کے گرد گھومنے لگا یہ چاند تھا جسے بچے "چندا ماموں" کے نام سے جانتے ہیں۔

سورج زمین اور چاند اور دوسرے سیارے اپنے اپنے مدار میں تیرتے رہے اور سورج کی تابکاری بڑھتی گئی لیکن یہ گرماہٹ زمین پر اثر انداز نہ ہو سکی کیوں کہ زمین پر ٹھنڈی گیسوں کا غلاف لپٹا ہوا تھا اور اس کی سطح پر پالے کی تہہ تھی۔ زمین کے اندر بڑی گرمی تھی۔ اس کے اندر کی نکلتی ہوئی گرمی سے اس کی فضا درہم برہم ہو کر طوفانی شکل اختیار کرنے لگی پھر جہاں جہاں زمین

کے اندر سے گرمی باہر نکلنے لگی تھی وہاں کی سطح جگہ جگہ سے پگھلنے لگی اور زمین کے نیچے کی گرمی گیس کی صورت میں بڑی قوت کے ساتھ باہر نکلی، ساتھ ہی گرم گرم لاوا بھی بہہ نکلا اور لاوے کی بہت چوڑی جھیلیں زمین کی سطح پر بن گئیں اور کہیں کہیں یہ ہوا لگنے سے ٹھنڈی ہو کر سخت ہو گئیں۔ پھر تقریباً چار ارب بیس کروڑ سال گزر گئے۔ زمین کی شکل ہی بدل گئی۔ پہلا براعظم بنا جو گرم اور ویران تھا۔ پھر فضا ٹھنڈی ہونے لگی اور پانی کے بخارات بارش میں تبدیل ہو کر نیچے گرنے لگے لیکن زمین کی سطح اتنی گرم تھی کہ وہ یہ نمی جذب نہ کر سکی اور پانی بھاپ بن کر دوبارہ اوپر اٹھنے لگا جس کی وجہ سے مسلسل بارشیں ہوتی رہیں آخر کار زمین کی سطح پانی جذب کرنے لگی جس سے اس میں ٹھنڈک پیدا ہونے لگی پھر چار ارب سال ہوئے تو زمین پر نہایت زبردست اور خوفناک طوفان اٹھنے لگے جس سے ٹوٹ پھوٹ کا ایک نیا عمل شروع ہوا۔ یہ عمل ایک نئی قسم کی فضا بنانے لگا جو شائد زندگی کے لئے تھا۔ ان طوفانوں کا زور ٹوٹا تو بجلیاں چمکنے لگیں پھر تین ارب نوے کروڑ سال اور گزر گئے۔ زمین کے نیچے جمع شدہ مواد گرمی سے باہر نکلنے کے لئے زور لگانے لگا جس سے زمین زلزلوں کی زد میں آگئی۔ آہستہ آہستہ جھیلیں بنیں پھر پانی بہنے لگا، دریا شروع ہوئے اور سمندر بننے لگے۔ تین ارب سال گزر گئے تو زندگی کی ابتدا کم گہرے پانی کے سمندروں سے شروع ہو گئی۔ غالباً اسی زمانے میں چاند زمین کے خاصا قریب آگیا تھا جس کی وجہ سے سمندروں میں خوفناک مدو جزر اٹھنے لگے اور بے شمار شہاب ثاقب زمین پر گرنے لگے۔

ایک ارب سال اور بیتا، برفانی دور آگیا۔ زمین کی سطح نرم نرم برف سے ڈھک گئی پھر اکتالیس کروڑ سال ہوئے اور سمندروں کے ساحلوں پر پودے اگنے لگے۔ زمین پر یہ سب سے پہلے پودے تھے۔ پودے آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔ ان پودوں کے نام بھی عجیب عجیب تھے۔ فرن، گھوڑا دم اور کلب موس۔ یہ پودے بعد میں زمین پر ہونے والے زلزلوں سے اندر دھنس گئے اور بعد میں کوئلہ اور تیل بن گئے۔ تیس کروڑ سال گزرنے پر براعظم وہاں نہیں رہے جہاں اب ہیں۔ زمین پر تبدیلیوں کی وجہ سے خشکی اور پانی میں فرق ہوتا رہتا تھا۔ بھانت بھانت کے پودے رینگنے والے جانور اور مچھلیاں نظر آنے لگیں۔ بڑے بڑے قدو قامت والے جانور زمین پر بھاگنے دوڑنے لگے۔ یہ ڈائنو سار تھے۔ پھر پندرہ کروڑ سال گزر گئے تو سمندروں کا زمانہ آگیا۔ سمندروں کا پانی براعظموں کی طرف پھیلنے لگا۔ پانی جگہ جگہ سے زمین کو کاٹنے لگا تو پہاڑ بننے لگے پھر اچانک ایک ڈرامائی تبدیلی آئی جس کی وجہ سے تمام جاندار مر گئے اور پھر پورے ۷۰۰۰۰۰۰ سال گزر گئے یہاں تک کہ نیا برفانی دور آیا۔ پندرہ ہزار سال بعد سمندر کے نیچے ایک آتش فشاں پھٹا جس سے اس بات کا پتہ چلا کہ پہاڑ بننے ابھی ختم نہیں ہوئے

ہیں۔ پھر زندگی دوبارہ شروع ہوئی اور زمین رنگ برنگ چیزوں سے بھر گئی۔

یہ کائنات اور اس پر جو مخلوقات موجود ہیں وہ سب ایک نظام کے تحت بنی ہیں اور ایک ٹھوس بناوٹ رکھتی ہیں۔ یہ چیزیں جن اسباب سے بنی ہیں، ان اسباب سے ان چیزوں کا ایک تعلق ہے۔ اشیا تبدیل ہو کر دوسری شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ ہماری زمین پر زندگی مختلف تبدیلیوں کے نتیجے میں آئی۔ زمین کا وزن ٹنوں میں ظاہر کیا جائے تو چھ کے بعد اکیس صفر لگانے پڑیں گے۔

زمین کی سطح کا رقبہ ۱۹ کروڑ ۶۸ لاکھ ۳۶ ہزار مربع میل ہے جس میں پانچ کروڑ ساٹھ لاکھ مربع میل خشکی اور چودہ کروڑ دس لاکھ مربع میل رقبے پر ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر پھیلا ہوا ہے۔ یعنی زمین کا تین چوتھائی حصہ پانی سے ڈھکا ہوا ہے۔ اگر خط استوا (فرضی خط) سے زمین کے اندر سے ایک خط اور گزارا جائے تو اس کی لمبائی ہوگی ۲۶ ۷۹ میل لیکن ایک قطب سے دوسرے قطب کے ملایا جائے تو خط کی لمبائی ۷۹۰۰ میل ہوگی۔ زمین اپنے قطبین پر ناشپاتی کی شکل کی نظر آتی ہے۔ خط استوا پر اس کا گھیر ۲۴ ہزار ۹۰۲ میل ہے جبکہ قطبین پر یہ لمبائی ۲۴ ہزار ۸۶۰ میل رہ جاتی ہے۔

زمین سورج کے گرد ۶۶ ہزار چھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہی ہے اور اس کا سورج سے اوسط فاصلہ نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے جب کہ چاند اس سے تقریباً دو لاکھ انتیس میل دور ہے۔ چاند کا قطر زمین کے قطر کا تقریباً ایک چوتھائی ہے۔

بے پناہ بڑھتی ہوئی آبادی، سائنسی تجربات اور ماحول کی آلودگی نے زمین کو تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ زمین اس وقت بارود کے ڈھیر پر اپنے انجام کی منتظر ہے اور کسی وقت بھی کوئی انسان چنگاری دکھا کر اسے اپنے انجام کو پہنچا دے گا اور وہی دن قیامت کا ہوگا جس کا قرآن پاک میں تفصیل سے ذکر ہے۔

آنکھ مچولی کا سالانہ خریداری کا کوپن

نام _____

مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں _____

رقم _____ بذریعہ _____

پتہ _____

_____

فون نمبر _____

لالچ بُری بلا ہے

محمد عمران خان

کچھ دوست گئے سیر کو دریا کے کنارے
کرنے لگے وہ جوں ہی ساحل کے نظارے
دیکھی انہوں نے اک شے دریا میں تیرتی
جو لالچی تھا سمجھا کمبل ہے قیمتی
دریا میں کُودا فوراً، پہنچا وہ جب قریب
عقدہ کھلا یہ اس پر حالت ہوئی عجیب
سمجھا میں جس کو کمبل وہ کالا ریچھ ہے
پکڑا ہوا ہے جس کو، وہ اس کی پیٹھ ہے
اس ریچھ نے اچانک اس کو پکڑ لیا
ہاتھوں سے لالچی کو اک دم جکڑ لیا
پانی کے دوش پر جب بہتا وہ جا رہا تھا
"لالچ بری بلا ہے" کہتا وہ جا رہا تھا

آخری بات

کسی بھی کام کو مقررہ وقت پر سر انجام دینا پابندی وقت کہلاتا ہے۔ دنیا میں وہی لوگ کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں جو اپنا کام وقت پر شروع اور وقت پر ختم کرتے ہیں۔ وقت کسی بھی امیر غریب یا پھر حاکم اور محکوم کو نہیں دیکھتا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

خبر لو وقت کی اپنے، خبر لو
اُڑا جاتا ہے جو کرنا ہے کر لو

یعنی کسی بھی کام کو مقررہ وقت پر کر لو ورنہ تاخیر کے باعث انسان بڑے بڑے نقصانات اٹھاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مشہور فاتح نپولین کا جرنیل میدان جنگ میں چند منٹ دیر سے پہنچا تو نتیجہ یہ ہوا کہ اسے شکست فاش ہوئی۔

وقت ایک بڑی دولت ہے۔ انسان کی کھوئی ہوئی دولت مل جاتی ہے مگر وقت ایک ایسی دولت ہے جو کبھی واپس نہیں آتی۔ وقت کی پابندی زندگی کا ایک بہترین اصول ہے۔ اور جو لوگ اس سنہری اصول پر عمل پیرا ہوتے ہیں وہ دنیا میں نیک نام اور عزت پاتے ہیں۔ اسی طرح اسلام کے تمام ارکان بھی ہمیں وقت کی پابندی کا درس دیتے ہیں۔

طلبا کے لئے بھی وقت کی پابندی بہت ہی ضروری ہے۔ اگر ایک طالب علم وقت پر اُٹھے، وقت مقررہ پر اسکول جائے، وقت پر کھانا کھائے اور وقت پر کھیلے تو وہ بڑی متوازن زندگی بسر کر سکتا ہے۔

چاند اور سورج کا طلوع و غروب ہونا گرمی سردی بہار اور خزاں کا آنا بھی وقت کا تصور پیش کرتے ہیں۔ اور اگر وقت پر یہ سب نہ ہو تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بھی وقت کی پابندی پسند ہے۔

بہادر اور جیالے
کوئس کے متوالے
قیمت
RS. 6 -
پیارے دوستو!
ننجا ٹرٹلز کا ایک اور کارنامہ
کوئس کی مزیدار SOFT DRINKS
آپ کے پسندیدہ ننجا ٹرٹلز آپ کے لئے چار مزیدار
اور لاجواب ذائقے لائے ہیں
اورنج کولا آئس کریم سوڈا لیچی
NON-RETURNABLE بوتلوں میں
نہ DEPOSIT کا جھگڑا،
نہ بوتل واپس کرنے کی زحمت
گڑیا، پپو، امی، ابو، سب کی پسند
QUICE
ORANGE
کوئس® بہترین

REGD. No. M-266 APRIL 1994
MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI